UGUR-101(N)
Urdu Nazm

U. P. Rajarshi Tandon
Open University

UGUR-101 (N) اردو نظم

Urdu Nazm (UGUR-101)

Advisory Committee

Prof. Satyakam — **Vice-Chancellor**
Prof. S.P. Tiwari — Director, School of Humanities
Dr. Vinay Kumar — Registrar

Course Design Committee

Prof. Shabnam Hameed — HOD, Department of Urdu, University of Allahabad, Prayagraj
Dr. Shareefuddin — Associate Prof. HOD, Department of Urdu
Ratan Sen PG College, Bansi, Kapilvastu, Siddharth Nagar,
Dr. Zafrullah Ansari — Department of Urdu, University of Allahabad, Prayagraj
Dr. Ashutosh Srivastava — Assistant Prof., Department of Urdu, Mahatma Gandhi PG College, Fatehpur, U.P.
Dr. Abdul Rahman — Assistant Prof. (Urdu), School of Humanities,UPTROU, Prayagraj

Course Co-Ordination

Dr. Abdurrahman Faisal — School of Humanities,UPTROU, Prayagraj

Editor

Prof. Nasim Ahmad — Ret. Prof. Department of Urdu, BHU, Varansi

Writer

Prof. Tauqeer Ahmad — Department of Urdu, Delhi University, New Delhi
Block-I (Unit: 1,2)
Prof Moinuddin A. Jinabad — Department of Urdu, JNU, New Delhi
Block-I&II (Unit: 3, 4)
Prof. Fazale Imam Rizvi, — Department of Urdu, University of Allahabad
Block-II (Unit: 5, 6)
Prof. Abdul Haq — Department of Urdu, Delhi University, New Delhi
Block-IV (Unit: 11)
Prof. Diwan Hannan — Department of Education in Languages, New Delhi
Block-IV (Unit: 13&14)
Dr. Musharraf — Asst. Prof., Department of Urdu, BHU, Varansi
Block-III (Unit: 7-9)
Dr. Muhammad Asif — Asst. Prof., Department of Urdu, Gautam Buddh University
Block-IV (Unit: 10&12)

© Uttar Pradesh Rajarshi Tandon Open University, Prayagraj 2024

ISBN: 978-81-19530-51-9

All Rights are reserved. No part of this work may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing from the Uttar Pradesh Rajarshi Tondon Open University, Prayagraj.

Printed and Published by Colonel Vinay Kumar Registrar, Uttar Pradesh Rajarshi Tandon Open University, 2024.

Printed By : Chandrakala Universal Pvt. 42/7 Jawahar Lal Neharu Road, Prayagraj.

UGUR-101(N)

کورس کی ساخت:

پہلا پرچہ: اردو نظم

بلاک ۱: نظم کا آغاز، اقسام اور پس منظر

اکائی ۱: اردو میں نظم نگاری کا آغاز وارتقا
اکائی ۲: اقسام (پابند نظم، نظم معریٰ، آزاد نظم، نثری نظم)
اکائی ۳: اردو نظم کا تہذیبی وسماجی پس منظر

بلاک ۲: مختلف تحریکات کے زیر اثر اردو نظم

اکائی ۴: اردو نظم اور ترقی پسند تحریک
اکائی ۵: اردو نظم اور حلقۂ ارباب ذوق
اکائی ۶: اردو نظم اور انجمن پنجاب

بلاک ۳: نمائندہ نظم گو شعراء اور ان کی مشہور نظمیں

اکائی ۷: نظیر اکبر آبادی......آدمی نامہ
اکائی ۸: خواجہ الطاف حسین حالی......انتخاب مسدس
اکائی ۹: اکبر الہ آبادی......مستقبل

بلاک ۴:

اکائی ۱۰: چکبست ......آوازۂ قوم
اکائی ۱۱: علامہ اقبال......شعاعِ امید
اکائی ۱۲: جوش ملیح آبادی......البیلی صبح

بلاک ۵:

اکائی ۱۳: اسرار الحق مجاز......آوارہ
اکائی ۱۴: اختر الایمان......ایک لڑکا

کورس کا تعارف:

زیرِنظر کتاب ''اردو نظم نگاری'' چودہ اکائیوں پر مشتمل ہے۔اس میں نظم نگاری کے متعدد گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اردو نظم کا پہلا گہوارہ دکن ہے۔جس کی ابتدا نویں صدی ہجری میں ہوئی۔دکنی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔پہلا دور چودھویں صدی سے پندرہویں صدی تک اور دوسرا دور سولہویں صدی سے سترہویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔

کتاب کی پہلی اکائی 'اردو نظم نگاری کا آغاز وارتقا' ہے۔اس میں نظم کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس کے ارتقائی مراحل کو بیان کیا گیا ہے۔یہ مراحل دکن سے لے کر شمالی ہند تک اور ترقی پسند تحریک،حلقہ ارباب ذوق نیز موجودہ صورت حال پر محیط ہیں۔

دوسری اکائی کا عنوان 'نظم کی اقسام' ہے۔اس اکائی میں نظم کی مختلف ہیئتیں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ابتدا میں نظم نے اردو شاعری کی کلاسیکی ہیئتوں کو ہی اپنایا لیکن بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنا دامن بھی وسیع کیا اور نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی اصناف کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی۔جس کی وجہ سے آج اردو نظم کا سرمایہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔

تیسری اکائی 'اردو نظم کا تہذیبی وسماجی پس منظر' ہے۔اردو نظم کو تہذیبی وسماجی عناصر نے مختلف موضوعاتی تصورات عطا کیے۔ مثلاً وطنیت،مناظر فطرت کی عکاسی،انقلاب وغیرہ۔جدید نظم نگاری کا آغاز انجمن پنجاب سے ہوا۔اس ضمن میں محمد حسین آزاد کی کوششیں سب سے نمایاں ہیں۔

اکائی چہارم 'اردو نظم اور ترقی پسند تحریک' پر مشتمل ہے۔اردو ادب کے ارتقاء میں بھی مختلف تحریکات ور جحانات کا اہم کردار رہا ہے اور ہر تحریک نے ادب کو وسعت عطا کی ہے لیکن اردو ادب کو متاثر کرنے میں بالخصوص دو تحریکات کا ذکر ناگزیر سمجھا جاتا ہے جن میں پہلی ''علی گڑھ تحریک'' ہے جس کے روح رواں سرسید احمد خاں ہیں اور دوسری ''ترقی پسند تحرک'' ہے جس کی بنیادیں استوار کرنے میں سجاد ظہیر نے کارہائے نمایاں انجام دیا۔

پانچویں اکائی میں 'اردو نظم اور حلقۂ ارباب ذوق' کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔حلقے کے شعراء کی بدولت مغرب کی علامت نگاری،تاثریت،امیجزم،وجودیت اور سرریلزم سے اردو شاعری روشناس ہوئی۔فرائیڈ کے نفسیاتی نظریات کے اثرات بھی اردو نظم میں دکھائی دینے شروع ہوئے۔اس طرح اردو نظم نے انسان کے داخل کی کائنات کا عرفان بخشا۔

اکائی ششم میں 'اردو نظم اور انجمن پنجاب' پیش کیا گیا ہے۔انجمن پنجاب کا قیام ایک تاریخی قدم تھا۔کرنل ہالرائڈ اس انجمن کے سرپرست تھے اور انہیں کی صدارت میں ۱۸۶۷ء میں پہلی بار جلسہ ہوا جس میں مولانا محمد حسین آزاد نے 'نظم اور کلام موزوں' کے باب میں کافی اہم لکچر دیا۔

ساتویں اکائی 'نظیر اکبرآبادی اور ان کی نظم آدمی نامہ' کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔نظیر نے زندگی کے گونا گوں مسائل مثلاً مذہب،عشق،موسم،تیوہار،کھیل کود،تفریحات،موت،زیست،نیرنگی زمانہ،بچپن،جوانی،بڑھاپا،مفلسی،سماجی ناانصافی وغیرہ پر نظمیں لکھیں۔

آٹھویں اکائی 'خواجہ الطاف حسین حالی اور ان کے مسدس' پر ہے۔حالؔی نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی لیکن جدید اردو نظم کو پروان چڑھانے اور اسے فروغ دینے میں انھوں نے اپنا خون جگر صرف کیا اور اسی لیے اردو نظم نگاری کی تاریخ میں انھیں امتیازی مقام حاصل ہے۔

نویں اکائی 'اکبرالہ آبادی کی اور ان کی نظم مستقبل' پر ہے۔اکبؔر الہ آبادی کو اردو نظم کی نشو نما اور فروغ میں منفرد مقام حاصل

ہے۔ اکبر نے اردو نظم نگاری میں ایک نئے طرز یعنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے طنز ومزاح کو سماج اور معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔

دسویں اکائی 'چکبست اور ان کی نظم آوازہ قوم' کو موضوع بنایا گیا ہے۔ چکبست کا دور ہندوستانی سیاسی وسماجی بیداری کا یہی زمانہ تھا۔ چکبست اس سیاسی بیداری کی تحریک کے پوری طرح سے ہم نوا تھے۔ وہ ایک سچے وطن پرست کی طرح یہی پیغام اپنی شاعری سے دیتے رہے کہ ہم کو وطن سے محبت ہو اور وطن کے رہنماؤں سے بھی پیار ہو۔

گیارہویں اکائی 'علامہ اقبال اور ان کی نظم شعاع امید' پر مشتمل ہے۔ ہماری شعری روایت میں اقبال کا اردو کلام ایک حیرت انگیز اضافہ ہے۔ وہ ہمارے جذبات اور محسوسات کا ایک ایسا مرکب ہے جس میں ان گنت پہلو شامل ہیں۔ اقبال بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ انھیں بیانیہ پر قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے روایت سے ہٹ کر غزل کو نیا امتیاز اور رنگ وآہنگ دیا۔

بارہویں اکائی 'جوش ملیح آبادی اور ان کی نظم البیلی صبح' کو محیط ہے۔ جوش انقلابی شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے بدلتے ہوئے سماجی حالات ان کی شاعری کے موضوع ہیں۔

تیرہویں اکائی 'مجاز اور ان کی نظم آوارہ' پر ہے۔ مجاز لکھنوی بھی ان ہی شعرا میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقی کاوشوں سے ترقی پسند ادب میں بیش قیمتی اضافہ کیا۔

چودھویں اکائی 'اختر الایمان اور ان کی نظم ایک لڑکا' پر مشتمل ہے۔ اختر الایمان نے اپنی نظموں میں علامتوں اور استعاروں کے ذریعے احساسات کو پیش کیا۔ انھوں نے اپنی نظموں میں عام گفتگو کی زبان کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔

طلبہ کی سہولت کی غرض سے ہر اکائی میں سوالات دیے گئے ہیں تا کہ وہ اپنی معلومات کی جانچ خود کر سکیں اور مشکل الفاظ کے معانی بھی درج کیے گئے ہیں اور آخر میں مزید مطالعے کے لئے موضوع سے متعلق اہم کتابوں کے نام درج کیے گئے ہیں تا کہ طلبہ ان سے استفادہ کر سکیں۔

بلاک۔ا کا تعارف:

بلاک۔ا تین اکائیوں پر مشتمل ہے۔ پہلی اکائی 'اردو نظم نگاری کا آغاز وارتقا' کے عنوان سے درج ہے۔ اس میں نظم کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس کے ارتقائی مراحل کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ مراحل دکن سے لے کر شمالی ہند تک اور ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق نیز موجودہ صورت حال پر محیط ہیں۔

دوسری اکائی کا عنوان 'نظم کی اقسام' ہے۔ اس اکائی میں نظم کی مختلف ہیئتیں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ابتدا میں نظم نے اردو شاعری کی کلاسیکی ہیئتوں کو ہی اپنایا لیکن بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنا دامن بھی وسیع کیا اور نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی اصناف کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی۔ جس کی وجہ سے آج اردو نظم کا سرمایہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔

تیسری اکائی 'اردو نظم کا تہذیبی وسماجی پس منظر' ہے۔ اردو نظم کو تہذیبی وسماجی عناصر نے مختلف موضوعاتی تصورات عطا کیے۔ مثلاً وطنیت، مناظر فطرت کی عکاسی، انقلاب وغیرہ۔ جدید نظم نگاری کا آغاز انجمن پنجاب سے ہوا۔ اس ضمن میں محمد حسین آزاد کی کوششیں سب سے نمایاں ہیں۔

اکائی: 1 اردو نظم کا آغاز وارتقا

ساخت

1.1 اغراض ومقاصد
1.2 تمہید
1.3 نظم کی تفہیم
1.4 اردو نظم کی خصوصیات
1.5 دکن میں نظم کا ارتقا
1.6 شمال میں نظم کا ارتقا
1.7 انجمن پنجاب کی تحریک
1.8 نظم نگار
1.9 جدیدیت کی ابتدا
1.10 خلاصہ
1.11 اپنی جانچ خود کیجیے
1.12 فرہنگ
1.13 سفارش کردہ کتابیں

1.1 اغراض ومقاصد

۱۔ نظم کی تعریف اوراس کی خصوصیات کے متعلق علم حاصل کرسکیں گے۔
۲۔ نظم کے آغاز کے متعلق جان سکیں گے۔
۳۔ عہد بہ عہد اردو نظم کے آغاز وارتقا کا جائزہ لے سکیں گے۔
۴۔ مختلف تحریکات کے زیرِ اثر اردو نظم میں ہونے والے فروغ سے آگاہی حاصل کرسکیں گے۔

1.2 تمہید

اردو شعری اصناف میں صنف نظم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ویسے تو لفظ نظم نثر کے مقابلے میں تمام شعری اصناف کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن نظم اردو شاعری میں خود بحیثیت صنف کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ جس طرح اردو کی مقبول شعری اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ اصناف موجود ہیں چوں کہ ان اصناف کی اپنی مخصوص صنفی شناختی امتیازات ہیں اوران کی پہچان بھی ہم اسی حوالے سے کرتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ اردو کی شعری روایت میں ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن میں کسی مخصوص موضوع پر تسلسل کے سات اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان نظموں کا ایک مرکزی خیال بھی ہے لیکن ان کی ہیئتیں مختلف ہیں۔ یہاں نظم سے مراد اسی قسم کی شاعری سے ہے۔ اس طرح نظم وہ مخصوص صنف سخن ہے جس میں بے پناہ معنوی وسعت ہے۔ تسلسل

خیال اور ارتکاز فکر کی حامل اس صنف کی شناخت نہ تو صرف موضوع اور نہ ہیئت پر منحصر ہے۔ کیوں موضوعات اور ہیئتوں کے لحاظ سے یہ ایک متنوع اور ہمہ گیر صنف ہے۔ کہ اس کے ساتھ موضوعات اور ہیئت کو مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔

اردو شاعری کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ موضوعاتی نظمیں جو کسی مخصوص عنوان کے تحت تخلیق کی جاتی ہیں محمد حسین آزاد اور حالی سے پہلے بھی اردو شاعری میں موجود تھیں۔ اگر نظم کا تحقیقی مطالعہ تاریخی حوالے سے کیا جائے تو شعری روایت میں نظم کی ایسی بہت سی مثالیں ہمیں مل جائیں گی جو اس وقت کے مختلف مروجہ اصناف میں بکھری ہوئیں ہیں۔ اردو نظم کے سلسلے میں اس بات سے بھی اعراض ممکن نہیں کہ مغربی شاعری سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ اس صنف کا رشتہ اردو شاعری کی قدیم روایت سے بھی گہرا رہا ہے۔ اس اس اکائی میں ان تمام گوشوں پر روشنی ڈالی جائے گی جو اردو نظم کو جدید صورت میں تشکیل دینے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔

1.3 نظم کی تفہیم

نظم عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی لڑی یا ہار پرونے کے ہیں۔ مختلف لغات میں نظم کے معانی و مفاہیم کو کئی طرح سے بیان کیا گیا ہے مثلاً موتی پرونا، ترتیب دینا، آراستہ کرنا، کلام موزوں کرنا وغیرہ وغیرہ۔ مجموعی طور پر نظم سے مراد ایسا کلام ہے جس میں کسی موضوع یا خیال کو جذبات و احساسات اور تسلسل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ بحیثیت مجموعی لغوی اعتبار سے نظم کے معنی پرونے کے ہیں اور نثر کے معنی بکھرنے کے۔ گویا نظم اور نثر باہم دیگر متضاد ہیں۔ کلاسیکی ادب کی تنقید میں نظم کا لفظ نثر کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے۔ جس سے مراد اصناف شاعری ہے اس میں تمام شعری اصناف قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، قطعہ، رباعی کے ساتھ ساتھ غزل کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ لیکن شاعری کی اصطلاح میں نظم کو غزل کے مقابلے میں برتا گیا ہے۔ نظم کے برعکس غزل کی ہیئت مخصوص ہوتی ہے اس کے تمام اشعار قافیہ، ردیف بحر و اوزان کی پابندی کے متقاضی ہونے کے ساتھ اشعار ایک دوسرے سے مربوط نہیں ہوتے بلکہ غزل کا یہ شعر مکمل اکائی ہوتا ہے۔ جبکہ نظم کے اشعار عروضی پابندیوں کے ساتھ موضوع اور خیال کے اعتبار سے ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہیں۔ جدید نظم میں غزل کی طرح ہیئت کی بھی تخصیص نہیں ہوتی کسی بھی ہیئت مثلاً مثمن، مخمس، مربع، معریٰ، آزاد غیرہ ہیئتوں میں نظمیں لکھی جا سکتی ہیں اور لکھی گئی ہیں۔

کلاسیکی شاعری میں جس طرح نظم کو مثنوی، مرثیہ، قصیدہ وغیرہ کے حوالے سے متعارف کیا جاتا ہے۔ جدید عہد میں نظم کی ان اصناف کا رواج تقریباً کم ہو گیا ہے۔ اس کے برعکس جدید تناظر میں نظم کی جدید ہیئتیں جس میں نظم معریٰ، آزاد نظم نثری نظم و غیرہ کو نظم کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

غزل اردو شاعری کی سب سے مقبول اور توانا صنف ہے، نظم شاعری کی وہ دوسری مقبول ترین صنف ہے جسے غزل کے مقابلے میں رکھا جاتا ہے۔ غزل کی مقبولیت اپنی جگہ مسلم ہے مگر نظم اردو کی وہ صنف ہے جس نے غزل کے مدمقابل اپنی شناخت قائم کی۔ قدیم زمانے سے تا حال نظم اپنی خصوصیات کی بنا پر زندہ و تابندہ ہے۔ نظم کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا تسلسل ہے۔ تسلسل یعنی موضوع اور اشعار میں ایک ربط اور ہم آہنگی کا سلسلہ جس سے نظم عروج کی جانب سفر کرتی نظر آتی ہے۔ نظم کے تمام اشعار یا بند ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہوئے تمام اشعار موضوع سے ہم آہنگ ہو کر ایک دوسرے کے پیچھے چلتے نظر آتے ہیں۔ نظم کی ایک بڑی خصوصیت وضاحت و صراحت بھی ہے جو شاعر کو کسی واقعے یا کسی قصے کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی مکمل آزادی اور وسیع میدان فراہم کرتی ہے۔

1.4 اردو نظم کی خصوصیات

اردو نظم کی خصوصیات میں ایک خصوصیت نظم کی ہیئت میں تنوع ہے۔غزل کی طرح نظم میں کسی ہیئت کی تخصیص یا پابندی نہیں ہوتی نظم کی مختلف اصناف اور ان اصناف کی مختلف ہیئتیں ہوسکتی ہیں۔ کلاسیکی نظم کی پابند اصناف جن میں مثنوی، مرثیہ، قصیدہ وغیرہ میں تسلسل کے ساتھ وسعت بیان کے مواقع موجود تھے آج جدید عہد میں بھی نظم معریٰ، آزاد نظم، نثری نظم وغیرہ کی ہیئتوں میں مختلف مضامین کو نظم کرنے کی بھر پور گنجائش موجود ہے۔

نظم کی ایک بڑی خصوصیت موضوعات کا تنوع بھی ہے جس میں شاعر کو ہر طرح کے موضوعات نظم کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔شاعر اپنے مزاج اور مذاق کے مطابق اخلاقی، اصلاحی، سیاسی، سماجی، معاشی، عشقیہ ہر طرح کے موضوعات پر نظمیں لکھ سکتا ہے اور لکھی جاتی رہی ہیں۔قلی قطب شاہ، نظیر اکبرآبادی، محمد حسین آزاد، حالی، اقبال، فیض، اختر الایمان، مخدوم، ن-م-راشد وغیرہ کے یہاں مختلف ہیئتوں اور موضوعات پر نظموں کے عمدہ نمونے موجود ہیں۔

جدید نظم کی ایک اہم خصوصیت ردیف وقافیہ کی قید سے آزادی ہے۔نظم میں غزل کی طرح ردیف وقافیہ کی پابندی نہیں ہوتی جس کی وجہ سے بقول حالی شاعر زبردستی ایک ہی مضمون کو الفاظ بدل بدل کر بیان کرنے پر مجبور نہیں ہوتا بلکہ نظم میں ردیف قافیہ کی قید سے آزادی کی بنا پر شاعر نظم کے فن کی خصوصیات وضاحت وصراحت کو نبھانے میں کامیاب نظر آتا ہے۔جدید نظم کی ہیئت نظم معریٰ نے ردیف وقوانی کی قید سے آزادی حاصل کی تھی آزاد نظم میں ردیف قوافی کے علاوہ بحر میں لچک پیدا ہوئی اور نثری نظم نے ان تمام تر پابندیوں سے آزادی حاصل کرلی۔

اردو نظم کا میدان بے حد وسیع ہے موضوعاتی اور ہیئتی سطح پر نظم کا دامن وسیع تر ہے۔اگر کلاسیکی نظم کے حوالے سے گفتگو کریں تو ادب کی تاریخ میں نثر کے علاوہ تمام شعری اصناف کو نظم کے دائرے میں رکھا جاتا تھا جس میں مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، قطعہ، رباعی، شہرآشوب کے علاوہ غزل کو بھی نظم کے دائرے میں رکھا جاتا تھا۔لیکن شاعری کی اصطلاح میں نظم کو غزل کے مقابلے میں رکھا گیا ہے۔کلاسیکی ادب میں نظم یعنی پابند نظم میں ردیف وقافیہ، بحر اور مقررہ اوزان کی پابندی لازمی ہونے کے باوجود نظم مقبول و معروف رہی ہے۔ان نظموں میں عروضی پابندیوں کے باوجود موضوعات اور اشعار کی تعداد کی قید نہیں ہوتی تھی جس کی وجہ سے نظم اپنی وسعتوں میں پھیلتی رہیں۔کلاسیکی اردو شاعری کا بڑا حصہ پابند نظموں ہی پر مشتمل ہے۔قدیم عہد کے بیشتر شعراء نے پابند نظموں کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔

جدید عہد میں مغرب کے زیر اثر اردو نظم میں ہیئتی تجربے ہوئے جس میں نظم معریٰ، آزاد نظم، نثری نظم، ہائیکو، ترائیلے، ثلاثی وغیرہ مغرب ہی سے مستعار ہیں مگر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اردو نظم نے انگریزی نظم کی ہیئتوں کو ہو بہو قبول نہیں کیا بلکہ انہیں اپنی زبان اور اس کے تخلیقی مزاج کے مطابق ڈھال کر الگ شناخت قائم کی۔اردو کی معریٰ نظم صرف قافیہ وردیف کی پابندی سے آزاد ہے بحور اور اوزان کی پابندی سے نہیں۔اردو میں اس کے لیے کسی مخصوص بحر کی پابندی لازمی نہیں ہوتی۔اسی طرح آزاد نظم بھی مغرب ہی سے مستفید ہے مگر یہ بھی انگریزی کی Free Verse سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں قافیہ ردیف کی پابندی سے آزادی کے باوجود بحر واوزان سے مکمل آزادی نہیں۔اردو میں آزاد نظم کے مصرعوں میں ارکان کی تعداد کم یا زیادہ ہو سکتی ہے مگر کسی ایک بحر کا ہونا لازمی ہے۔آزاد نظم کے بعد اردو میں نثری نظم وجود میں آئی جس نے بحر اور وزن کی تمام پابندیوں سے مکمل طور پر آزادی حاصل کرلی۔مگر یہ نثری نظم نثر سے یوں مختلف ہے کہ اس میں شعری آہنگ ہوتا ہے جو اسے نثر سے جدا کرتا ہے۔لہٰذا یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید اردو شعراء نے مغربی نظم کی ہیئت سے استفادہ تو ضرور کیا مگر آنکھ بند کر کے اس کی تقلید نہیں کی۔

1.5 دکن میں نظم کا ارتقا

شاعری کی مقبول ترین صنف غزل کی طرح نظم کے ابتدائی نقوش بھی دکن ہی میں ملتے ہیں۔ دکن میں نظم کے جو ابتدائی نمونے ملتے ہیں وہ طویل نظموں، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، قطعہ، رباعی، مثلث وغیرہ کی شکل میں موجود ہیں۔ کلاسیکی شاعری میں نثر کے علاوہ تمام شعری اصناف کو نظم کے دائرے میں شامل کیا جاتا تھا۔ دکن میں اردو نظم کے ابتدائی نمونے پندرہویں صدی عیسوی بہمنی عہد میں بندہ نواز گیسودراز اور میراں جی شمس العشاق کے یہاں ملتے ہیں۔ انہوں نے صوفیانہ اور اخلاقی تعلیمات کو سادہ اور عام فہم زبان میں بیان کیا ہے۔ دکن میں بہمنی عہد کے علاوہ عادل شاہی دور بھی شعر و ادب کے فروغ کا عہد رہا ہے۔ دکن میں قطب شاہی عہد ادب کے فروغ کا عہد تھا۔ قلی قطب شاہ خود ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا جسے اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ قلی قطب شاہ سے قبل دکن میں نظم کی مستقل روایت نہیں ملتی۔ اس کے دیوان میں مختلف موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں جن میں ہندوستانی تہذیب رقص کرتی نظر آتی ہے۔ ان نظموں میں ہندوستانی رسم و رواج، موسم، تہوار، پھل پھول اور ہندو مسلم اتحاد کی پختہ روایت کا سلسلہ ملتا ہے۔ قلی قطب شاہ ایک بادشاہ حسن کا پرستار اور عاشق مزاج شاعر تھا۔ اس نے اپنی نظموں میں عشق کے ذاتی تجربوں کا تذکرہ شدت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس عہد میں قلی قطب شاہ کے علاوہ وجہی، غواصی، مقیمی، نشاطی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے نظم کے ارتقا میں فروغ دیا۔

1.6 شمال میں نظم کا ارتقا

شمالی ہند میں اردو نظم کے ابتدائی نمونے جعفر زٹلی اور افضل جھنجھانوی کے یہاں ملتے ہیں۔ افضل نے ''بکٹ کہانی'' کے عنوان سے ایک منظوم بارہ ماسہ لکھا جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ جعفر زٹلی شاعری کی تاریخ میں غیر سنجیدہ ہجو گو شاعر مشہور ہیں ان کی نظموں میں فحاشی اور عریانی کا اظہار ملتا ہے مگر باوجود اس کے ان کی نظموں کی ادبی و تہذیبی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ شاعری میں ہجو اور شہر آشوب کے علاوہ مختصر نظم کے ابتدائی نمونے بھی ان کے یہاں ملتے ہیں۔ اردو نظم کے ارتقا میں نظیر اکبرآبادی کی شاعری ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ نظیر اکبرآبادی کا نام نظم کی روایت میں اس لحاظ سے منفرد اور معتبر ہے کہ انھوں نے روایت کے برخلاف نظم کو حسن و عشق کے فرضی قصوں سے نکال کر عوام اور عوامی مسائل سے ہم کنار کرایا۔ نظیر نے متنوع موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ جن میں ہندوستانی موسم تہوار، ہولی، دیوالی، شادی بیاہ کی رسمیں، عوامی دلچسپی اور ان کی زندگی سے جڑے ہوئے معمولی معمولی واقعات ان کی شاعری کے محبوب موضوع ہیں۔ جیسے تل کے لڈو، ریچھ کا بچہ، گلہری کا بچہ، خوانچے والا، ترکاری فروش، ککڑی والا، بنجارہ نامہ، آدمی نامہ جیسی نظموں کے علاوہ ہندو مذہب کے دیوتاؤں کرشن جی، شیو جی وغیرہ پر بھی نظمیں لکھی ہیں جنہوں نے قومی ہم آہنگی کی روایت کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ نظیر کی نظموں میں خالص ہندوستانی روح نظر آتی ہے۔

1.7 انجمن پنجاب کی تحریک

اردو نظم کی تاریخ میں ''انجمن پنجاب'' کا قیام ایک جدید موڑ کی حیثیت کا حامل ہے۔ جس کی بنیاد کرنل بالرائڈ کی سرپرستی

میں رکھی گئی۔ اس انجمن کے روح رواں محمد حسین آزاد تھے۔ انجمن کے زیر اثر نظم نگاری ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا۔ انجمن کے کچھ تعلیمی، اخلاقی، اصلاحی و تہذیبی مقاصد تھے۔ محمد حسین آزاد نے اپنی تقریر میں اردو کی روایتی شاعری پر تنقید کی اور شاعری میں اخلاقی اصلاحی مقاصد کی حمایت کرتے ہوئے جدید طرز کے مشاعروں کی بنیاد ڈالی جس میں عنوان کے تحت نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ اس سے اردو نظم نگاری میں موضوعاتی نظم کی تحریک کا آغاز ہوا۔ انجمن کا پہلا مشاعرہ ۱۸۷۴ء میں برسات کے عنوان پر منعقد کیا گیا۔ انجمن کے مشاعروں میں محمد حسین آزاد اور حالی کے نام صف اول کے شعراء میں رکھے جاتے ہیں۔ انھوں نے انجمن کے مشاعروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ محمد حسین آزاد کی بیشتر نظمیں مثنوی کی ہیئت میں صبح امید، حب وطن، خواب امن، ابر کرم، زمستان وغیرہ۔ حالی نے بھی ان مشاعروں میں چار معرکۃ الآرا مثنویاں برکھارت، نشاط امید، مناظرہ رحم وانصاف، اور حب وطن لکھیں، جن میں موضوعات کے علاوہ جذبات و کیفیات کی عکاسی، زبان کی صفائی ان کی خصوصیات ہیں۔ حالی اور آزاد نے منظوم انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے۔ جنہوں نے بعد کے شعرا کو بھی متاثر کیا۔

1.8 نظم نگار

نظم کی روایت میں اکبر الہ آبادی کا نام منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ اردو شاعری میں طنز و مزاح کے حوالے سے اکبر کا نام سب سے بلند ہے۔ اکبر الہ آبادی طنز و مزاح کے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے طنز و مزاح کی شاعری میں سنجیدہ موضوعات کو بڑی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا۔ اکبر کے عہد میں ہندوستان کا نوجوان انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ مغربی تہذیب اور طرز زندگی سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو اس میں رنگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اکبر نے اس مغربی تہذیب پر اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں خوب خوب تنقید کی۔ ان کے طنز کے ان تیروں سے حکومت وقت اور سیاسی نظام بھی بچ نہ سکا۔ یہ تمام رجحانات اکبر کی جدید تہذیب سے دشمنی نہیں بلکہ مغرب کی اندھی تقلید سے مخالفت اور مشرق سے محبت کا ثبوت ہیں۔

نظم کے ارتقا میں بہت اہم نام علامہ اقبال کا ہے۔ اقبال نے نظم کو حب الوطنی کی شدت اور فلسفیانہ افکار سے مملو کر دیا۔ انھوں نے محض حب الوطنی کے گیت ہی نہیں گائے بلکہ اپنی شاعری سے ایک سوئی ہوئی ہم مردہ قوم کو بیدار کر کے حرکت و عمل اور خودی کا سبق پڑھایا۔ نظموں کو حب الوطنی کی سرشاری کے ساتھ عالمی وطنیت کا سلیقہ سکھایا۔ جس کی اساس اسلام کا عالمی وطنیت کا وہ وسیع تر تصور ہے جو تمام بنی نوع انسان کو فلاح و بہبود کا پیغام دیتا ہے۔ اسلام جمود کے برخلاف حرکت و عمل کا پیغام دیتا ہے اقبال کی پوری شاعری کا مرکز و محور بھی حرکت و عمل ہی ہے۔ اقبال نے قومی و ملی شاعری کو فلسفیانہ ذہن عطا کیا۔ ان کی ابتدائی نظموں میں قومی وطنی موضوعات کا بڑی شدت سے اظہار ملتا ہے اور ان کی ملی نظمیں پوری اردو شاعری میں منفرد اور بلند مقام کی حامل ہیں۔ ہمالہ، نیا شوالہ، تصویر درد، ترانہ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت ایسی نظمیں ہیں جن میں اقبال نے قومی یک جہتی اور حب الوطنی کے جذبات کو خوب خوب ابھارا ہے۔ اقبال کی ملی و فلسفیانہ نظمیں ذوق وشوق، شکوہ، جوابِ شکوہ، خضر راہ، طلوع اسلام، مسجد قرطبہ، ساقی نامہ وغیرہ ہیں۔ اس عہد میں اقبال کے علاوہ اقبال کے معاصر شعراء برج نرائن چکبست، تلوک چند محروم، ظفر علی خان، سیماب اکبرآبادی وغیرہ نے بھی قومی نظمیں لکھی ہیں۔ اقبال کے آخری زمانے کے معاصر شعراء میں جوش ملیح آبادی کا نام اہم ہے۔ جوش کے یہاں شباب اور انقلاب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان کا لہجہ بلند آہنگ اور تیور باغیانہ تھے۔ زبان کے لحاظ سے جوش کی شاعری ادب میں منفرد مقام رکھتی ہے۔

''انجمن پنجاب''، حالی محمد حسین آزاد اور شبلی کی نیچرل شاعری، سید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک، اقبال کی قومی وطنی بلند آہنگ

شاعری، جوش کا انقلابی آہنگ ان سب نے مل کر ترقی پسند تحریک کے لئے زمین ہموار کردی۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند شعرا نے ادب برائے ادب کے برخلاف ادب برائے زندگی کا نعرہ اس پرجوش انداز میں لگایا کہ ہر خاص وعام کو اس جانب متوجہ ہونا پڑا۔ ترقی پسندوں نے نظم کے ارتقا میں ایک نئے انقلاب کے ساتھ قدم رکھا۔ ان کے یہاں اجتماعیت پر خاصا زور تھا ظلم، ناانصافی اور غیر برابری کے خلاف انہوں نے آواز بلند کی۔ مزدور کسان کی حمایت میں پرزور نعروں کے ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑ پھینکنے پر آمادہ کیا۔ ہندوستان کی آزادی کے لئے جن کی راہوں میں قربان ہونے کا شدید جذبہ، اجتماعی مفاد، ادب میں فن کے بجائے موضوع کی اہمیت بغاوت کا شدید جذبہ وغیرہ ان کے محبوب موضوع تھے مگر ان موضوعات وخیالات کو پیش کرنے میں اکثر یہ شعرا توازن برقرار نہ رکھ سکے جس کے نتیجے میں شاعری مقصدیت کا شکار ہو کر نعرے بازی کی حدود میں داخل ہوگئی۔ جس نے شاعری اور اس تحریک کو بڑا نقصان پہنچایا۔ ترقی پسند شاعروں میں مخدوم، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، اسرارالحق مجاز، فیض احمد فیض، اختر الایمان، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، منیب الرحمٰن، ظہور کاشمیری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں مگر ان شعراء میں فیض احمد فیض، ساحر، مجاز، جاں نثار اختر وغیرہ نے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود شاعری کے فنی وادبی اصولوں کو ملحوظ رکھا۔ ترقی پسند شعراء میں فیض کا مقام منفرد اور بلند ہے۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود توازن کے ساتھ ترقی پسندی اور نظم کے مزاج کو بڑی خوبصورتی اور فنکاری سے نبھایا۔ ان کی شاعری میں نعرے بازی یا چیخ و پکار کا انداز نہیں ملتا بلکہ وہ کوئے یار سے سوئے دار تک سفر بڑے سلیقے سے طے کر لیتے ہیں جس میں ان کے یہاں فنی محاسن مجروح نہیں ہوتے بلکہ نکھر کر آتے ہیں۔

1.9 جدیدیت کی ابتدا

ہندوستان اور اردو ادب میں جدیدیت کی ابتدا ۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۰ء کے آس پاس مانی جاتی ہے۔ دراصل جدیدیت کا رجحان مغرب کی دین اور ترقی پسند تحریک کا ردعمل بھی ہے۔ ترقی پسند تحریک نے جس طرح فرد کے بجائے اجتماعیت پر سارا زور صرف کر دیا تھا۔ جدید شعرا نے جماعت کے برخلاف فرد اور فرد کی انفرادیت کو اہمیت دی۔ ان شعراء نے فرد کی نفسیاتی وجنسی خواہشات کو بھی موضوع بنایا جسے ترقی پسندوں نے پس پشت ڈال دیا تھا۔ ترقی پسندوں میں روایت سے سرے سے رشتہ منقطع کرنے کا رجحان عام تھا مگر جدید شعراء کے یہاں روایت کی جانب مڑ کر دیکھنے کا رجحان ملتا ہے۔ ان کے یہاں مادیت سے بیزاری، مایوسی، تنہائی، بیگانگی ہندوستان کی آزادی، بٹوارے کا کرب، ہجرت کی تکلیف، رشتوں کا ٹوٹتا بھرم، فساد، خوں ریزی، اجڑی بستیاں وغیرہ ایسے ہی موضوعات تھے جنہیں جدید شعرا نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ مگر ان موضوعات کو پیش کرنے میں یہ شعراء بھی اپنی شاعری کو انتہا پسندی کی حدود میں داخل ہونے سے بچا نہ سکے جن میں کئی شعراء نفسیاتی موضوعات کو پیش کرنے میں عریانیت پر اتر آتے ہیں۔ جدید شاعری کی شناخت جن شعراء سے ہوتی ہے ان شعراء میں خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی، وحید اختر، بلراج کومل، عمیق حنفی، شاذ تمکنت، مظہر امام، شہریار، کمار پاشی، شباب جعفری، احمد فراز، عرش صدیقی، ساقی فاروقی، ناصر شہزاد، منیر نیازی، ناصر کاظمی، مصطفیٰ زیدی وغیرہ اپنی خصوصیات کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان شعرا نے جدید نظم کے حوالے سے نظم کو ترقی پسندوں کی اشتراکیت کے برخلاف فرد کی انفرادیت کی جانب متوجہ کرایا۔ جدید شعراء کے یہاں فن اور فن کاری کی مکمل آزادی کو اولیت حاصل تھی۔ جس نے نظم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

1.10 خلاصہ

شاعری کی مقبول ترین صنف غزل کی طرح نظم کے ابتدائی نقوش بھی دکن ہی میں ملتے ہیں۔ نظم کے یہ ابتدائی نمونے مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، مثلث، رباعی، شہر آشوب وغیرہ کی شکل میں موجود ہیں۔ کلاسیکی ادب میں تمام شعری اصناف کو نظم کے معنی میں استعمال کیا جاتا تھا۔ دکن میں اردو نظم کے ابتدائی نمونے پندرہویں صدی عیسوی میں بندہ نواز گیسو دراز اور میراں جی شمس العشاق کے یہاں ملتے ہیں۔ انہوں نے صوفیانہ اور اخلاقی تعلیمات کو سادہ اور عام فہم زبان میں پیش کیا۔ دکن میں قلی قطب شاہ سے قبل نظم کی مستقل روایت نہیں ملتی۔ قلی قطب شاہ کو پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب، قومی ہم آہنگی اور عشق کے سچے جذبات کی عکاسی ملتی ہے جس میں تجربوں کی آنچ گہری ہے۔ قطب شاہی عہد دکن میں نظم کے فروغ کا عہد رہا ہے۔ اس عہد میں غواصی، مقیمی، وجہی، نشاطی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ شمالی ہند میں نظم کے ابتدائی نمونے جعفر زٹلی اور افضل جھنجھانوی کے یہاں ملتے ہیں۔ افضل کی شناخت بکٹ کہانی اور جعفر زٹلی ہجو گو شاعر کے نام سے مشہور ہیں۔ شمالی ہند میں نظیر اکبر آبادی کا نام منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ نظیر نے اردو نظم میں حسن و عشق کے موضوعات کے برخلاف خالص عوامی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا جس میں ہندوستانی تہذیب اور عوام سے ان کا گہرا رشتہ ہے۔ انجمن پنجاب، محمد حسین آزاد، حالی، شبلی کی نیچرل شاعری، سر سید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک، اقبال کی پیغامی، جوش کی انقلابی شاعری ان سب نے مل کر ترقی پسند تحریک کے لیے زمین ہموار کر دی۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند شعرا نے ادب برائے زندگی کے نظریے کے تحت بڑے پر جوش انداز میں انقلاب کا نعرہ بلند کیا۔ ان کی شاعری ظلم، ناانصافی اور غیر برابری کے خلاف اعلان جنگ تھی۔ جس میں ان شعراء نے سارا زور موضوعات پر صرف کر دیا۔ جس کے لئے ان شعراء نے شاعری کے فنی اصولوں کو بھی پس پشت ڈال دیا۔ اکثر اوقات شاعری محض نعرے بازی بن کر رہ گئی۔ جس نے شاعری اور اس تحریک کو بڑا نقصان پہنچایا۔ اہم ترقی پسندوں میں ساحر، مجاز، مخدوم، علی سردار جعفری، اختر الایمان، جاں نثار اختر اور فیض وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان ترقی پسند شعراء میں سب سے اہم اور منفرد مقام فیض کا ہے۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود شاعری کو نعرے بازی سے بچائے رکھا۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے آس پاس ہندوستان میں جدیدیت کی ابتدا ہوئی۔ جدیدیت میں ترقی پسند تحریک کی اجتماعیت کے برخلاف فرد کو اولیت حاصل تھی۔ ان شعراء کے یہاں فرد اور ادیب کی مکمل آزادی کا تصور ملتا ہے۔ اب چاہے وہ جنسی ہو یا پھر ادبی۔ ان شعراء کے یہاں تنہائی، اداسی، ہجرت کا کرب، بیگانگی جیسے موضوعات جدید شاعری کی شناخت بن کر ابھرے۔ ان شعراء میں ناصر کاظمی، باقر مہدی، وحید اختر، بلراج کومل، کمار پاشی، عمیق حنفی، مظہر امام، احمد فراز، کشور ناہید، پروین شاکر، منیر نیازی وغیرہ کے نام اہم ہیں، جنہوں نے جدید شاعری کے موضوعات کو بخوبی برتنے کے ساتھ شاعری کے فنی تقاضوں سے بھی منہ نہیں موڑا ہے۔ اس طرح ہر عہد میں نظم نے اپنے عہد کے مطابق اپنی خصوصیات کے ساتھ ارتقا و عروج کا سفر طے کیا ہے۔

1.11 اپنی جانچ خود کیجئے

سوال: اردو نظم کی تعریف بیان کیجئے۔

جواب: نظم عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لڑی یا ہار پرونے کے ہیں۔ مختلف لغات میں نظم کے مختلف معانی و مفاہیم بیان کئے گئے ہیں مثلاً موتی پرونا، ترتیب دینا، آراستہ کرنا، کلام موزوں کرنا وغیرہ۔ نظم میں کسی خیال یا واقعہ کو تسلسل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ کلاسیکی ادب میں نظم کے معنی تمام شعری اصناف مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، شہر آشوب، رباعی، قطعہ کے علاوہ غزل کو

بھی نظم کے دائروں میں رکھا جاتا تھا لیکن شاعری کی اصطلاح میں نظم کو غزل کے مقابلے میں رکھا گیا ہے۔ غزل کے لئے ایک مخصوص ہیئت متعین ہے غزل کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے جبکہ نظم ہیئت میں اشعار خیال اور موضوع کے اعتبار سے ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہیں جن میں باہمی تسلسل ہوتا ہے۔ جدید نظم ردیف وقافیہ سے آزاد ہوتی ہے۔ غزل کے برخلاف عروضی اصولوں میں بھی نرمی برتی گئی ہے۔ جس سے نظم کے دائروں میں وسعت اور لچک پیدا ہوئی اور نظم ہر طرح کے موضوعات کو بخوبی نبھانے کے قابل ہوگئی۔

سوال: اردو نظم کی خصوصیات بیان کیجئے۔

جواب: اردو نظم کی سب سے بڑی خصوصیت تسلسل بیان ہے۔ نظم کے اشعار ایک دوسرے میں پیوست اور موضوع سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ اشعار یا موضوعات کی کوئی قید نہیں ہوتی، کسی بھی موضوع اور کتنے بھی اشعار نظم میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ کلاسیکی پابند نظم کے برخلاف جدید نظم ردیف وقافیہ کی بندشوں سے آزاد ہے۔ جدید نظم کی ایک بڑی خصوصیت کو ہیئت میں تنوع ہے غزل کی طرح نظم میں کی ہیئت کی تخصیص نہیں کی گئی۔ جدید نظم کا میدان بے حد وسیع ہے۔ نظم معریٰ ردیف وقافیہ سے آزاد ہوئی تو آزاد نظم نے عروض کے اصولوں میں لچک پیدا کر لی اور نثری نظم نے ان تمام حد بندیوں کو توڑ کر شعری آہنگ کو برقرار رکھتے ہوئے نظم کے میدان میں نئی وسعتیں پیدا کرلیں۔ جس سے نظم مختلف قسم کے موضوعات کو وضاحت وصراحت کے ساتھ بیان کرنے کا دم بھرنے لگی۔

سوال: کیا آزاد نظم عملی طور پر عروضی اصولوں سے آزاد ہے؟

جواب: آزاد نظم مغرب کی دین ہے انگریزی ہیئت Free Verse سے ماخوذ ہے مگر اردو نظم نے مغربی ہیئت کی آنکھ بند کر کے تقلید نہیں بلکہ اردو زبان کے مزاج اور مذاق کے مطابق اس میں تبدیلیاں کر کے اسے اپنایا ہے۔ آزاد نظم عروضی اصولوں سے مکمل طور پر آزاد نہیں ہے۔ قافیہ وردایف کی قید سے آزادی کے باوجود آزاد نظم بحر واوزان سے مکمل طور پر آزاد نہیں ہے۔ اس میں کوئی مخصوص بحر نہیں ہوتی مگر پوری نظم کسی ایک بحر میں ہوتی ہے مصرعوں میں کم یا زیادہ ارکان ہوسکتے ہیں جس میں کوئی مصرح بڑا یا چھوٹا ہوسکتا ہے مگر مکمل طور سے آزاد نظم عروضی اصولوں سے آزاد نہیں ہے۔

سوال: دکن میں اردو نظم کی ابتدا اور ارتقاء پر روشنی ڈالئے؟

جواب: اردو نظم کے ابتدائی نقوش دکن میں ملتے ہیں۔ دکن میں نظم کے ابتدائی نمونے مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، مسدس، مخمس اور قطعہ اور رباعی وغیرہ کی شکل میں ملتے ہیں۔ دکن میں اردو نظم کے ابتدائی نمونے بندہ نواز گیسو دراز اور میراں جی شمس العشاق کے یہاں ملتے ہیں۔ ان شعراء نے اپنی شاعری میں صوفیانہ مسائل اور اخلاقی تعلیمات کو سادہ اور عام فہم زبان میں بیان کیا۔ دکن میں اردو شاعری کے فروغ کا زمانہ پندرہویں صدی عیسوی میں گولکنڈہ کے بادشاہ قلی قطب کا دور حکومت ہے۔ قلی قطب شاہ اعلیٰ پائے کا شاعر تھا جسے اردو شاعری کی تاریخ میں پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کے دیوان میں غزل اور نظم دونوں کا مقام اہم ہے، جس میں اس نے مختلف موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔ اس کی نظموں میں جیتا جاگتا ہندوستان نظر آتا ہے، جس میں ہندوستانی موسم، پھل پھول، تہوار، رسم ورواج اور حب الوطنی کے جذبا ساتھ قومی ہم آہنگی کا پیغام ملتا ہے۔ قلی قطب شاہ ایک بادشاہ تھا، وہ حسن کا پرستار اور عاشق مزاج شاعر تھا۔ اس نے اپنی شاعری میں عشق کے ذاتی تجربوں کا تذکرہ جزئیات وجذبات کی شدت کے ساتھ کیا ہے۔ اس کی شاعری دکنی شاعری کے ارتقا میں ایک نئے موڑ کا اضافہ ہے۔ اس عہد میں قلی قطب شاہ کے علاوہ وجہی، غواصی، رستمی، مقیمی وغیرہ کے نام بھی نظم کے فروغ میں اہمیت کے حامل ہیں۔ دکن میں قطب شاہی

عہد کے علاوہ عادل شاہی عہد بھی رہا ہے۔ خود علی عادل شاہ، برہان الدین جانم کے یہاں شاعری کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مجموعی طور پر دکن میں چودھویں اور پندرھویں صدی تک کا زمانہ ادب کے فروغ کا زمانہ تھا۔

سوال: ترقی پسند اور جدید نظم کی خصوصیات بیان کیجئے۔

جواب: ۱۹۳۶ء میں ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ ترقی پسند تحریک کے منشور میں ادب برائے ادب کے برخلاف ادب برائے زندگی کے نظریے کو اولیت حاصل تھی۔ ان کے یہاں شاعری کے فنی اصولوں کو ثانوی اور موضوع کو اولین حیثیت حاصل تھی۔ اس تحریک کے زیر اثر جو شاعری وجود میں آئی وہ مقصدی تھی جس کا مقصد ہندوستان کی آزادی اور معاشرے میں غیر برابری کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ ترقی پسند تحریک کی سب سے بڑی خصوصیت لہجے کی بلند آہنگی تھی، جس میں انھوں نے وطن کی آزادی، سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت کے ساتھ اجتماعیت کا نعرہ اس پرزور انداز میں لگایا کہ ہر خاص و عام کو اس جانب متوجہ ہونا پڑا۔ مقصدیت کی دھن میں اکثر ترقی پسند شعراء نے شاعری کے فنی محاسن کو پس پشت ڈالنے سے بھی گریز نہیں کیا اس کے نتیجے میں اکثر اوقات یہ شاعری محض نعرے بازی بن کر رہ گئی جسے اس تحریک کے زوال کا سبب بھی کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں جدیدیت کی ابتدا ۱۹۵۵ء، ۱۹۶۰ء کے آس پاس مانی جاتی ہے۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر شعراء نے اجتماعیت پر سارا زور صرف کر دیا تھا۔ جدید نظم گو شعراء نے اس کے برخلاف فرد کی انفرادیت اس کی تنہائی، جنسی اور نفسیاتی مسائل کو موضوع بنایا جسے ترقی پسند شعراء نے پس پشت ڈال دیا تھا۔ جدید شاعری میں فرد کے ساتھ فنکار کو بھی اپنے جذبات واحساسات کو بیان کرنے کی مکمل طور پر آزادی حاصل تھی۔ جسے جدید نظم گو شعراء نے اپنی نظموں میں خوب خوب برتا ہے۔

سوال: اردو نظم کے ارتقا میں ''انجمن پنجاب'' کا قیام ایک انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے وضاحت کیجیے؟

جواب: اردو نظم کے ارتقا میں ''انجمن پنجاب'' کا قیام ایک انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے جس کی بنیاد کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں رکھی گئی۔ اس کے روح رواں محمد حسین آزاد تھے۔ ۳۰ رمئی ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے زیر اثر مصرح طرح کے بجائے موضوعاتی مشاعروں کی ابتداء ہوئی۔ بعد میں یہ تجربہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا اور ایسے مشاعروں کا سلسلہ چل نکلا۔ ان مشاعروں میں نظم پڑھنے والے شاعروں میں محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کے نام صف اول پر آتے ہیں۔ انجمن کا پہلا مشاعرہ ۱۹ راپریل ۱۸۷۴ء میں ہوا۔ اس جلسے کی شروعات آزاد نے اپنی تقریر ہی میں اردو کی روایتی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے اصلاحی مقاصد کی جانب متوجہ کرانے کے لئے مدلل بحث کی اور نمونے کے طور پر مثنوی ''شب قدر'' پیش کی۔ اس انجمن کے تحت جدید طرز کے مشاعروں کی بنیاد قائم ہوئی جس میں عنوان کے تحت نظمیں پڑھی جانے لگیں۔ انجمن کے مشاعروں میں مختلف موضوعات برسات، زمستان، امید وغیرہ کے عنوان سے کل گیارہ مشاعرے ہوئے ان مشاعروں میں حالی اور محمد حسین آزاد کے علاوہ متعدد شعراء نے شرکت کی جن میں انور حسین، ذوق کاکوری، اشرف بیگ، راحت دہلوی وغیرہ نے شرکت کی۔ انجمن کے مشاعروں میں آزاد اور حالی بڑا اہم کارنامہ رہا۔ محمد حسین آزاد کی شاعری کو نیچرل شاعری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حالی نے ان مشاعروں میں نشاط امید، برکھارت، حب وطن، مناظرہ رحم وانصاف جیسی مثالی نظمیں کہیں۔ ان کی نظموں میں اخلاقی اصلاحی موضوعات میں قوم کے درد کا جذبہ نمایاں ہے۔ اس انجمن نے ایک تحریک کی صورت اختیار کی جو اردو نظم کے ارتقاء میں انقلابی موڑ کی حیثیت کی حامل ہے۔ بعد میں اس مقصدی اور افادی شاعری کا سلسلہ علامہ اقبال اور ترقی پسند شعراء کے یہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب ۳۰-۱۳۰ الفاظ میں دیجیے۔

سوال: نظم کی تعریف اور خصوصیت بیان کیجیے۔

سوال: نظم معریٰ اور پابند نظم میں فرق واضح کیجیے۔

سوال: آزاد نظم کی عرضی پابندیوں کی وضاحت کیجیے۔

سوال: نظم کے لغوی معنی کیا ہیں؟

سوال: دکن میں اردو نظم کے ارتقاء پر روشنی ڈالئے۔

سوال: اردو نظم کے ارتقاء میں نظیر اکبرآبادی کا مقام متعین کیجئے۔

سوال: اردو نظم کی روایت میں انجمن پنجاب کی اہمیت بتائیے؟

سوال: ترقی پسند تحریک کی نظمیہ شاعری میں مقصدیت کے حوالے سے گفتگو کیجئے۔

سوال: جدید نظم اجتماعیت کے برخلاف کس پر زور دیتی ہے؟

1.12 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
ارتکاز	اجتماع، ایک جگہ جمع ہونا	نصائح	نصیحت کی جمع، نیک مشورہ
شکست وریخت	ٹوٹ پھوٹ	فحاشی	بدچلنی، شرارت
مشرب	پانی پینے جگہ، چشمہ	طوائف الملوکی	ہل چل، بدنظمی
بہبود	بہتری، نفع	تعطل	بیکار ہونا، خالی ہونا
انفعالی	الگ ہونا، جدا ہونا	انحراف	پھر جانا، برخلاف
خلاقانہ	بنایا ہوا	تشہیر	مشہور کرنا، شہرت دینا
امتزاج	ملاوٹ، آمیزش	معتدل	اعتدال ہونا، توازن ہونا
ارتفاع	اونچان، بلندی	عمق	گہرائی
اتباع	پیروی، تقلید کرنا	ایمائیت	اشارہ کرنا
مافی الضمیر	اپنے بارے میں بتانا	بے مائیگی	بے مدد
قنوطیت	مایوسی، ناامیدی	التفات	متوجہ ہونا، رغبت
ابعاد	دوریاں، فاصلے	مماثل	نظیر، برابر
الیاتی	چھوٹا	علامیہ	عکامت
مدغم	پیوست کیا گیا	میراث	مال وراثت
بے ثباتی	ناپائیداری		

1.13 سفارش کردہ کتابیں

1.	خلیل الرحمٰن اعظمی	نئی نظم کا سفر
2.	وزیر آغا	نظم جدید کی کروٹیں
3.	وزیر آغا	اردو شاعری کا مزاج
4.	عبادت بریلوی	جدید شاعری
5.	ڈاکٹر محمد عقیل صدیقی	اردو نظم نظریہ و عمل
6.	یعقوب یاور	ترقی پسند اردو شاعری
7.	ڈاکٹر حنیف کیفی	نظم معری اور آزاد نظم
8.	آل احمد سرور	ادب اور نظریہ
9.	حامدی کاشمیری	جدید اردو نظم اور یورپی اثرات
10.	ڈاکٹر قمر رئیس/ عاشور کاظمی	ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر

اکائی: 2 نظم کی اقسام (پابند نظم، نظم معریٰ، آزاد نظم، نثری نظم)

ساخت

2.1 اغراض ومقاصد
2.2 تمہید
2.3 اردو نظم کے اقسام
2.4 پابند نظم
2.5 رباعی
2.6 نظم معریٰ
2.7 آزاد نظم
2.8 نثری نظم
2.9 خلاصہ
2.10 نمونہ امتحانی سوالات وجوابات
2.11 فرہنگ
2.12 سفارش کردہ کتابیں

2.1 اغراض ومقاصد

۱۔ اردو نظم کے مختلف اقسام کے متعلق معلومات حاصل کرسکیں گے۔
۲۔ پابند نظم کے متعلق علم حاصل کرسکیں گے۔
۳۔ نظم معریٰ کا علم حاصل کرسکیں گے۔
۴۔ آزاد نظم کے بارے میں جان سکیں گے۔
۵۔ نثری نظم کے بارے میں جان سکیں گے۔

2.2 تمہید

اس اکائی میں ہم آپ کو اردو نظم کی مختلف ہیئتوں سے واقف کرائیں گے۔ اردو میں زیادہ تر ہیئتیں فارسی سے لی گئی ہیں۔ کہیں کہیں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ اب وہ اردو ہی کی ہیئتیں متصور کی جاتی ہیں۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں اور بیرونی ممالک کی زبانوں سے بھی اردو نے کئی ہیئتیں لی ہیں ہم ان ہیئتوں کی وضاحت کریں گے، ان کی مثالیں دی جائیں گی اور اس اکائی کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔ بطور نمونہ امتحانی سوالات بھی درج کئے گئے ہیں۔ اپنی معلومات کی جانچ کا موقع بھی فراہم کیا گیا ہے۔ فرہنگ کے تحت نئے الفاظ کے معنی دیے گئے ہیں اور آپ کے مزید مطالعہ کے لیے سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی جارہی ہے۔ توقع ہے ان سب سے استفادہ کیا جائے گا۔

2.3 اردو نظم کے اقسام

اردو شاعری پر فارسی شاعری کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اردو میں پابند شاعری کی ہیئتیں بھی فارسی ہی سے مستعار ہیں۔مثنوی،مرثیہ،قصیدہ،رباعی،قطعہ،وغیرہ ایسی ہی ہیئتیں ہیں جنہیں اردو شعرانے بعینہٖ یا قدرے ترمیم کے ساتھ قبول کیا ہے۔اس باب میں اردو نظم کی پابند نظم،نظم معریٰ،آزاد نظم اور نثری نظم کے حوالے سے گفتگو مقصود ہے۔

2.4 پابند نظم:

اردو میں پابند نظم اس نظم کو کہتے ہیں جس میں عروضی اصول وضوابط ردیف قافیہ اور بحر کے مقررہ اوزان کی پابندی کی جاتی ہے۔ پابند نظم میں نہ تو موضوعات کی کوئی قید ہوتی ہے اور نہ اشعار کی تعداد کی۔شاعر کسی بھی موضوع پر اور کتنی ہی تعداد میں اشعار کہہ سکتا ہے۔بعض شاعروں نے چار اشعار پر مشتمل نظمیں بھی کہیں ہیں۔اردو شاعری کا بڑا حصہ پابند نظموں پر ہی مشتمل ہے۔ ابتدا سے لے کر آج تک تقریباً تمام شاعروں نے پابند نظم میں طبع آزمائی کی ہے اور آج بھی معریٰ اور آزاد نظموں کے باوجود پابند نظم نگاری کا رواج عام ہے۔مثنوی،رباعی،قطعہ،مثلث اور مسمط وغیرہ پابند اور اردو نظم کی مخصوص اور مقبول ہیئتوں میں شمار ہوتی ہیں۔

2.5 رباعی:

رباعی پابند نظم کی ہیئت میں ایک مقبول ترین ہیئت ہے۔ یہ چار مصرعوں کی مختصر نظم ہوتی ہے۔جس میں شاعر کسی ایک خیال کو نہایت اختصار کے ساتھ دو اشعار میں بیان کرتا ہے۔رباعی کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ چاروں مصرعے بھی ہم قافیہ ہوسکتے ہیں۔ رباعی کو دوبیتی یا ترانہ بھی کہتے ہیں۔ رباعی کے لئے چوبیس اوزان مخصوص ہیں جو بحر ہزج کے ساتھ زحاف لانے سے ترتیب پاتے ہیں اس طرح چار مصرعوں میں چوبیس اوزان میں سے کسی وزن پر ہوں رباعی کہلاتے ہیں۔انیس،دبیر،حالی،اکبر،جوش،یگانہ،فراق کی رباعیاں اردو ادب میں بہت مقبولیت حاصل کرچکی ہیں۔انیس کی ایک رباعی بطور نمونہ پیش کی جارہی ہے۔

گلشن میں صبا کی جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پر گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں ہو تیری ہے

۲-قطعہ

قطعہ کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں۔قطعہ ایک ایسی مختصر نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی خیال کو تسلسل اور اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔اس کے مطلع میں عموماً قافیہ نہیں ہوتا بلکہ قافیہ کی بنیاد پہلے شعر کے دوسرے مصرعے پر ہوتی ہے۔قطعہ میں کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ سترہ اشعار ہوتے ہیں۔مگر کئی شعرانے اس سے زیادہ کے قطعے بھی لکھتے ہیں۔ یہاں پر میر تقی میر کا ایک قطعہ پیش کیا جارہا ہے۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنوں
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اس اجڑے دیار کے
(میر تقی میر)

۳-مثنوی:

پابند نظم کی مقبول ترین ہیئت مثنوی ہے۔ مثنوی میں کسی طویل قصے کو اس کی تمام تر تفصیلات کے ساتھ بیان کرنے کی گنجائش باقی تمام شعری اصناف سے زیادہ ہوتی ہے۔ مثنوی کے ہر شعر میں مصرع اول اور ثانی ایک قافیہ میں لکھے جاتے ہیں پوری نظم میں ہر شعر کا قافیہ جدا ہو سکتا ہے۔ مثنوی میں موضوع اور اشعار کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ ربط کلام ضروری ہے یعنی تسلسل برقرار رہے۔

یہاں میر حسن کی مشہور زمانہ مثنوی سحر البیان کا ایک بند پیش کیا جا رہا ہے۔

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ
کہ تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ
کسی طرح کا وہ نہ رکھتا تھا غم
مگر ایک اولاد کا تھا الم
اسی بات کا اس کے دل پہ تھا داغ
نہ رکھتا تھا وہ اپنے گھر کا چراغ
وزیروں کو اک روز اس نے بلایا
جو کچھ دل کا احوال تھا کہہ سنایا
کہ میں کیا کروں گا یہ مال و متاع
فقیری کا ہے مرے دل کو خیال
فقیر اب نہ ہوں تو کروں کیا علاج
نہ پیدا ہوا وارث تخت وتاج
جوانی تو میری گئی اب گزر
نمودار پیری ہوئی سربسر
بہت ملک پر جان کھویا کیا
بہت فکر و دنیا میں رویا گیا
وزیروں نے کی عرض اے آفتاب
نہ ہو تجھ کو ذرہ کبھی اضطراب

مگر ہاں یہ اولاد کا ہے جو غم
سوا اس کا تردد بھی کرتے ہیں ہم
عجب کیا کہ ہووے تمہارے خلف
کرو تم نہ اوقات اپنے تلف
(میرحسن مثنوی سحرالبیان)

۴-ثلاثی

ثلاثی کو مثلث اور تثلیث بھی کہا جاتا ہے یہ تین مصرعوں پر مشتمل نظم ہوتی ہے تینوں مصرعوں کا وزن برابر ہوتا ہے۔ کبھی پہلا اور دوسرا، کبھی پہلا اور تیسرا اور کبھی تینوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور یہ تینوں مصرعے ایک اکائی بن کر مثلث کہلاتے ہیں۔ یہ اکائی ایک مکمل معنوی نظام کی حامل ہوتی ہے تین مصرعوں کی اکائیاں مل کر بھی مثلث کہلاتی ہیں۔ اردو نظم میں ثلاثی ایک باقاعدہ فنی ہیئت کی حیثیت سے مقبول رہی ہے۔ حمایت علی، مشتاق جاوید، احسان بن دانش، جاں نثار اختر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

یہاں ثلاثی کا ایک نمونہ پیش کیا جارہا ہے۔

کس طرح بھلا کھاتا
مفلس کی صداؤں سے
مغرور کا دروازہ
(مشتاق جاوید)

2.6 نظم معریٰ:

اردو میں نظم معریٰ انگریزی کی (Blank verse) سے بڑی حد تک متاثر ہے۔ (Blank verse) میں ردیف و قافیہ کے علاوہ بندوں کی بھی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ مصرعوں میں باہمی تسلسل کی کافی گنجائش ہوتی ہے جس میں شاعر اپنے خیالات کے اظہار کے لیے آزاد ہوتا ہے۔ اردو میں نظم معریٰ کی ابتدا بھی کافی تاخیر سے ہوئی۔ دراصل اردو شاعری عربی فارسی شاعری سے متاثر تھی اردو میں ان کے سامنے ایسا کوئی نمونہ نہیں تھا۔ اردو شعراء نے انگریزی سے استفادہ کرکے ایک نئے تجربے کے ساتھ اس صنف کو رواج دیا۔ آج ہماری اردو شاعری میں ایک قابل قدر سرمایہ نظم معریٰ میں موجود ہے۔

اردو شاعری کی صنف نظم معریٰ نے انگریزی کی (Blank verse) سے استفادہ ضرور کیا مگر یہ اس کی تقلید محض نہیں ہے۔ اردو شاعری کی نظم معریٰ نے انگریزی بلینک ورس کی صرف ایک خصوصیت یعنی ردیف و قافیہ کی قید سے آزادی کو مستعار لیا ہے باقی خصوصیات کو نہیں اپنایا۔ انگریزی (Blank verse) میں ایک بحر مخصوص ہے جس کو Pantamenter Lamb کے نام سے جانا جاتا ہے۔ لیکن اردو نظم معریٰ میں کسی ایک بحر کی تخصیص نہ ہوسکی اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نظم معریٰ قافیہ کی سختی کے خلاف وجود میں آئی تھی اس نظم میں قافیہ ردیف کی قید نہیں ہوتی مگر اوزان و بحور سے پوری طرح آزاد نہیں ہوتی، بلکہ اس میں بحر کے ارکان اور اس کے اوزان کے ساتھ صوتی بندشوں کی بھی پابندی ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ معریٰ نظم میں بحر کے مقررہ اوزان استعمال ہوتے ہیں یعنی اگر پہلے مصرعے میں بحر کے چار ارکان استعمال ہوتے ہیں۔ تو اس کی پابندی نظم کے ہر مصرع میں کرنی ہوگی۔ نظم معریٰ میں بحر یا مساوی وزن کی پابندی برقرار رہتی ہے۔ نظم معریٰ جاں نثار اختر کی نظم مہکتی ہوئی رات کا ایک بند دیکھئے۔

یہ ترے پیار کی خوشبو سے مہکتی ہوئی رات
اپنے سینے میں چھپائے ترے دل کی دھڑکن
آج پھر تری ادا سے مرے پاس آئی
کتنے لمحے کہ غمِ زیست کے طوفانوں میں
زندگی کی جلائے ہوئے باغی مشعل
تو مرا عزمِ جواں بن کے مرے ساتھ رہی
(جاں نثار اختر مہکتی ہوئی رات)

2.7 آزاد نظم:

اردو میں آزاد نظم کی ہیئت کا تجربہ بھی مغرب کی دین ہے جو اس قدر کامیاب ثابت ہوا کہ آج اردو شاعری میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اردو کے اکثر شعراء نے اس میں زور قلم آزمایا ہے۔ اردو میں آزاد نظم انگریزی کے (Free verse) فرانسیسی زبان کے (verse libre) کا لفظی ترجمہ ہے۔ جس کا اطلاق ان تمام نظموں پر ہوتا ہے جن میں قدیم عروضی اصولوں وضوابط سے انحراف کیا گیا ہو اور وہ نظم اپنی ضرورت کے مطابق ایک نئی شکل اور نئے انداز میں لکھی گئی ہو۔

انگریزی کی آزاد نظم کی تکنیک کو دو بنیادی خصوصیات کا حامل قرار دیا جاتا ہے اول آزاد نظم کی بنیاد وزن کے بجائے آہنگ پر ہوتی ہے۔ دورکن یا مصرعے کے بجائے (Strophe) اسٹرافی یعنی غیر مساوی وزن کے مصرعوں پر ہوتی ہے جس میں شاعر کو اپنے جذبات وخیالات کو بیان کرنے کی بڑی آزادی ہوتی ہے اس میں مصرعوں کی تعداد کا بھی تعین نہیں ہوتا شاعر ضرورت کے مطابق آہنگ کو تبدیل کر دیتا ہے۔

اردو کی آزاد نظم اوزان وبحور سے پوری طرح آزاد نہیں ہوتی۔ دراصل آزاد نظم میں ارکان اور بحری تخصیص نہیں ہوتی۔ جس کی وجہ سے مصرسے چھوٹے بڑے ہو جاتے ہیں اگر کسی نظم کے پہلے مصرع کی بحر میں چار بار فاعلن کی تکرار ہے تو نظم آزاد میں یہ گنجائش ہوتی ہے کہ نظم کے بعد کے مصرعوں میں کہیں ایک کہیں دو، تین اور کہیں چھ بار فاعلن استعمال ہو سکتا ہے۔ فیض احمد فیض کی ایک نظم بطور نمونہ پیش کی جا رہی ہے۔

نظم

سب کاٹ دو
بسمل پودوں کو
بے آب سسکتے مت چھوڑو
سب نوچ لو
بیکل پھولوں کو
شاخوں پہ بلکتے مت چھوڑو
یہ فصل امیدوں کی ہمدم
س بار بھی غارت جائے گی
سب محنت، صبح وشاموں کی

اب کے بھی اکارت جائے گی
(فیض احمد فیض)

2.8 نثری نظم:

اردو میں نثری نظم آزاد نظم کے بعد مقبول ہوئی۔ اوزان و بحور سے مکمل آزادی کے تصور نے اردو میں نثری نظم کو رواج دیا۔ نثری نظم بھی انگریزی (Prose poetry) کی تقلید ہے۔ نثری شاعری میں ردیف و قافیہ وزن اور بحر کی کی قید نہیں ہوتی۔ ہاں مگر اس میں ایک آہنگ ضروری ہوتا ہے۔ جو نثری شاعری کو نثر سے منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ بعض اوقات غیر ارادی طور پر مصرع اوزان کے تحت آجاتے ہیں مگر نثری نظم میں اس طرح کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ اس میں شعریت اور غنائیت ضروری ہے۔ عام طور پر وہی نثری نظمیں کامیاب ہیں جن میں غنائیت اور شعری آہنگ کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ نثری نظم بنیادی طور پر شاعری ہی ہوتی ہے۔ یہ شاعر کے شعری رویے پر منحصر ہوتی ہے۔ اردو میں نثری نظم میں علی سجاد ظہیر اور خورشید الاسلام کے نام نمایاں ہیں۔ نثری نظم کا پہلا مجموعہ ''پگھلا نیلم'' ہے۔ یہ ۱۹۶۴ء کے اواخر میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں عام ترقی پسند شعری نقطۂ نظر کے برخلاف مواد سے زیادہ شعریت کو اولیت دی گئی۔ حالاں کہ انہوں نے ان تخلیقات کو نظم کہنے سے گریز کیا ہے۔

خورشید الاسلام اور علی سجاد ظہیر کی نثری فلموں کے نمونے دیکھیے:

ننگوں
اور بھوکوں کا
یہ انسانی کوڑا کرکٹ
سڑک پر
کس نے بکھیرا ہے
اگر
انسان کی
آنکھ نہ ہوتی
تو کائنات اندھی ہوتی
(خورشید الاسلام)

2.9 خلاصہ

اردو شاعری پر بالخصوص فارسی شاعری کے اثرات گہرے ہیں۔ اردو میں فارسی کی کئی ہیئتوں کو مستعار لینے کا سلسلہ ملتا ہے۔ اردو کی شعری ہیئتوں میں غزل کے بعد پابند نظم کو بلند مقام حاصل ہے۔ پابند نظم میں ردیف و قافیہ کے ساتھ بحر اور وزن کی بھی پابندی ہوتی ہے لیکن اس میں موضوعات اور اشعار کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ اردو کی پابند نظموں میں مثنوی، رباعی، قطعہ، مسمط وغیرہ مقبول ہیں۔ مثنوی میں ہر شعر ہم وزن مگر ردیف و قافیہ جدا ہوتے ہیں۔ مثنوی میں کوئی قصہ تسلسل اور ربط کے ساتھ آگے بڑھتا ہے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ رباعی چار مصرعوں کی نظم ہوتی ہے جس میں کسی مضمون کو اختصار کے ساتھ مکمل طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ رباعی کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے جس میں چوتھے مصرعے کو اہمیت حاصل ہے۔ دراصل یہی مصرعہ پہلے تین مصرعوں کی جان ہوتا ہے۔ اسی طرح پابند نظم کی ہیئتوں میں قطعہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی خیال یا واقعہ کو دو یا دو سے

زائد اشعار میں بیان کیا جائے اور اس میں قافیہ پہلے کے شعر کے دوسرے مصرعے میں ہوتا ہے۔

اردو نظم نے ہندوستانی شعری ہیئتوں کے علاوہ مغربی زبانوں سے بھی ہیئتیں مستعار لی ہیں۔ جس میں نظم معریٰ، آزاد نظم اور نثری نظم مقبول ترین ہیئتیں ہیں۔ نظم معریٰ، ردیف وقافیہ کی قید سے آزاد ہے مگر یہ ارکان اور بحر کی پابندی سے آزاد نہیں ہوتی۔ آزاد نظم بھی مکمل طور پر عروضی اصولوں سے پوری طرح آزاد نہیں اس میں ارکان اور بحر کی تعداد مخصوص نہیں ہوتی جس کی وجہ سے مصرعے چھوٹے بڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے اسے آزاد نظم کہا جاتا ہے۔

نثری نظم اردو میں آزاد نظم کے بعد وجود میں آئی۔ اس میں ردیف قافیہ، بحر، وزن کی طرح کی پابندی نہیں ہوتی۔ مصرعے اور موضوعات کی بھی کوئی قید نہیں ہوتی مگر آہنگ اور غنائیت سے نثری نظم پر نکھار آتا ہے۔

2.10 نمونہ امتحانی سوالات وجوابات

سوال: پابند نظم کی دو مقبول ترین اقسام کے حوالے سے گفتگو کیجیے؟

جواب: مثنوی اور رباعی پابند نظم کی مقبول ترین ہیئتیں ہیں۔ پابند نظم کی مقبول ترین ہیئت مثنوی ہے۔ مثنوی میں کسی طویل قصے کو اس کی تمام تر تفصیلات کے ساتھ بیان کرنے کی گنجائش باقی تمام شعری اصناف سے زیادہ ہوتی ہے۔ مثنوی کے ہر شعر میں مصرع اول اور ثانی ایک قافیہ میں لکھے جاتے ہیں۔ پوری نظم میں ہر شعر کا قافیہ جدا ہو سکتا ہے مثنوی میں موضوع اور اشعار کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ ربط کلام ضروری ہے یعنی تسلسل برقرار رہے۔ پابند نظم کی ہیئت میں بھی یہ ایک مقبول ہیئت ہے یہ چار مصرعوں کی مختصر نظم ہوتی ہے۔ جس میں شاعر کسی ایک خیال کو نہایت اختصار کے ساتھ دو اشعار میں بیان کرتا ہے، رباعی کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ چاروں مصرعے بھی ہم قافیہ ہو سکتے ہیں۔ رباعی کو دوبیتی یا ترانہ بھی کہتے ہیں۔ رباعی کے لیے چوبیس اوزان مخصوص ہیں جو بحر ہزج کے ساتھ زحاف لانے سے ترتیب پاتے ہیں اس طرح چار مصرعوں میں چوبیس اوزان میں سے کسی وزن پر ہوں رباعی کہلاتی ہے۔ انیس، دبیر، حالی، اکبر، جوش، یگانہ، فراق کی رباعیاں اردو ادب میں بہت مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔

سوال: پابند نظم سے کیا مراد ہے؟

جواب: اردو میں پابند نظم اس نظم کو کہتے ہیں جس میں عروضی اصول وضوابط ردیف وقافیہ اور بحر کے مقررہ اوزان کی پابندی کی جاتی ہے۔ پابند نظم میں نہ تو موضوعات کی کوئی قید ہوتی ہے اور نہ اشعار کی تعداد کی۔ شاعر کسی بھی موضوع پر اور کتنی ہی تعداد میں اشعار کہہ سکتا ہے۔ بعض شاعروں نے چار اشعار پر مشتمل نظمیں بھی کہی ہیں۔ اردو شاعری کا بڑا حصہ پابند نظموں پر ہی مشتمل ہے۔ ابتدا سے لے کر آج تک تقریباً تمام شاعروں نے پابند نظم میں طبع آزمائی کی ہے اور آج بھی معریٰ اور آزاد نظموں کے باوجود پابند نظم نگاری کا رواج عام ہے۔ پابند نظم کی مختلف ہیئتیں ہیں۔ مثنوی، رباعی، قطعہ، مثلث اور مسمط وغیرہ پابند اردو نظم کی مخصوص اور مقبول ہیئتوں میں شمار ہوتی ہیں۔

سوال: نظم معریٰ اور آزاد نظم کی خصوصیات بیان کیجیے۔

جواب: نظم معریٰ اور آزاد نظم جدید نظم نگاری کی مقبول ترین ہیئتیں ہیں۔ اردو کی نظم معریٰ انگریزی کی بلینک ورس سے بڑی حد تک متاثر ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت قافیہ کی قید سے آزادی ہے۔ انگریزی کی (Blank verse) میں ایک بحر مخصوص ہوتی ہے جبکہ اردو نظم معریٰ میں بحر مخصوص نہیں مگر بحر کے ارکان اور اوزان کے ساتھ صوتی بندشوں کی بھی پابندی ہوتی

ہے۔اس میں بحر کے مقررہ اوزان استعمال ہوتے ہیں یعنی اگر پہلے مصرع میں بحر کے چار ارکان استعمال ہوئے ہیں تو اس کی پابندی نظم کے ہر مصرع میں کرنی ہوگی۔

سوال: آزاد نظم کے بارے میں لکھیے

جواب: اردو میں آزاد نظم کی ہیئت کا تجربہ بھی مغرب کی دین ہے جو انگریزی کے (Free verse) سے مستعار ہے جس میں نظم کی عروضی پابندیوں سے انحراف کر کے وزن کے بجائے آہنگ کو اولیت دی گئی ہے۔ یہ غیر مساوی وزن پر ہوتی ہے مگر اردو کی نظم پوری طرح عروضی اصولوں وضوابط سے عاری نہیں ہوتی۔ اس میں ارکان اور بحر کی تعداد متعین نہیں ہوتی جس کی وجہ سے مصرع چھوٹے بڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی نظم کے پہلے مصرع کی بحر میں چار بار فاعلن کی تکرار ہے تو نظم آزاد میں یہ گنجائش ہوتی ہے کہ بعد کے مصرعوں میں کہیں ایک دو، چار یا چھ بار فاعلن کا استعمال ہو سکتا ہے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب تین تین سطروں میں دیجیے۔

سوال: پابند نظم کی خصوصیات بیان کیجیے؟

جواب:..

....

....

سوال: مثلث کسے کہتے ہیں:

جواب:..

....

....

خالی جگہ پُر کیجیے۔

سوال: آزاد نظم انگریزی کی ہیئت......مستعار ہے۔

سوال: نثری نظم میں......کی قید نہیں ہوتی۔

سوال: رباعی......مصرعوں کی نظم ہے۔

سوال: مثنوی میں کسی قصے کو......کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

2.11 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
متنازعہ فیہ	جس چیز کے لئے جھگڑا ہا	ذوالجہت	کئی جہت کا مالک
منتشر	بکھرا ہوا	مستزاد	اضافہ کیا ہوا، بڑھایا ہوا
ترویج	رواج پانا	خیمہ زن	خیمہ لگانے والا
سوسن	آسمانی رنگ کا ایک پھول	نسترن	سیوتی کا پھول
لالہ	لال رنگ کیا بڑا پھول	ریاضت	محنت، مشقت

کشف	کھولنا، ظاہر کرنا	طلعت	چہرہ، رخ
فرسنگ	تین میل سے راز ء کا فاصلہ	معرفت	شناخت، پہچان
جفا کشی	ظلم وزیادتی	زمزمے	ترنم، نغمہ
طیلساں	سر اور کاندھے پر پڑی چادر	کاظمہ	ضبط کرنے والا
عتاب	ملامت، غصہ	خجل	شرمندہ، نادم
مموے	پیٹ پر کالی دھاری والا چھوٹا پرندہ	سوز	جلن، خلش

2.12 سفارش کردہ کتابیں

1. شمیم احمد — اصناف سخن اور شعری ہیئتیں
2. شمس الرحمٰن فاروقی — شعر، غیر شعر اور نثر
3. کلیم الدین احمد — اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ دوم
4. شمس الرحمٰن فاروقی — درس بلاغت
5. سید احتشام حسین — اردو ادب کی تنقیدی تاریخ
6. ڈاکٹر محمد عقیل صدیقی — اردو نظم نظریہ وعمل
7. پروفیسر احتشام حسین — اردو شاعری ارتقا (مقدمہ ادب پارے)

اکائی:3 اردو نظم کا تہذیبی وسماجی پس منظر

ساخت

3.1 اغراض ومقاصد

3.2 تمہید

3.3 اردو نظم کے تہذیبی وسماجی پس منظر کا تعارف

3.4 اہم خصوصیات

3.5 خلاصہ

3.6 اپنی معلومات کی جانچ کیجئے

3.7 نمونہ امتحانی سوالات

3.8 سفارش کردہ کتابیں

3.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں اردو نظم کے تہذیبی وسماجی پس منظر کو اس کے اصل سیاق میں دیکھنے اور اس کی خصوصیات بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

اردو نظم کے تہذیبی وسماجی پس منظر پر اظہار خیال کر سکیں۔

اردو نظم کے تہذیبی وسماجی رویوں کی شناخت کر سکیں۔

اردو نظم کے تہذیبی وسماجی عناصر کی خصوصیات بیان کر سکیں۔

3.2 تمہید

آپ یہ جان چکے ہیں کہ نظم کی تعریف کیا ہے؟ آپ اس کی خصوصیات سے بھی واقف ہو چکے ہیں۔ آپ کو علم ہو چکا ہے کہ نظم کی کتنی قسمیں ہیں۔ ہیئتوں کی بنیاد پر ان کے نام متعین کیے گئے ہیں۔ مثلاً پابند نظم، نظم معری، آزاد نظم، نثری نظم اور ان کی ذیلی قسمیں۔ آپ اردو نظم کے آغاز وارتقا سے بھی واقف ہو چکے ہیں۔ اردو نظم کو تہذیبی وسماجی عناصر نے مختلف موضوعاتی تصورات عطا کیے۔ مثلاً وطنیت، مناظر فطرت کی عکاسی، انقلاب وغیرہ۔ جدید نظم نگاری کا آغاز انجمن پنجاب سے ہوا۔ اس ضمن میں محمد حسین آزاد کی کوششیں سب سے نمایاں ہیں۔

3.3 اردو نظم کے تہذیبی وسماجی پس منظر کا تعارف

قلی قطب شاہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر تسلیم کیے گئے ہیں۔ ان کے کلیات میں شامل نظموں کے مطالعے سے جو نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں، ان میں اولیت ان کے تہذیبی وسماجی سروکاروں کو حاصل ہے۔ قلی قطب شاہ سے پہلے بابا فرید، امیر خسرو اور کبیر کے دوہوں میں خارجی محرکات، تہذیب وثقافت کے رنگ، سماجی عکاسی اور ان کے پردے میں متصوفانہ روح،

شاعری کی اساس بنتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔قلی قطب شاہ کی نظمیہ شاعری بنیادی طور پر سماجی ادراک اور تہذیبی بلوغت کی آئینہ دار ہے۔ان کے عہد کا منظر نامہ رسومیات،تفریحات،تہواروں کی چنک دمک،تقریبات کے تنوع اور مجموعی طور پر نشاطیہ تہذیب کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ان کی نظم ''بسنت'' کو خاص شہرت حاصل ہے۔عشق اور جنسی معاملات کا بیان ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ یہ وہی دور ہے جب شمالی ہند میں شہنشاہ اکبرحکومت کرر ہاتھا۔حکومت کی زبان فارسی تھی۔ ہندوی عوام میں مقبول تھی، لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے کہ شمال کے بجائے جنوبی ہند میں ہندوی کو تخلیقی اظہار کا وسیلہ پہلے بنایا گیا۔نظم اردو کی تاریخ کا باقاعدہ آغاز یہیں سے ہوا۔غزلیں،نظمیں،قصائداور مثنویوں کی ایک توانا روایت یہاں قائم ہوئی۔ فارسی کی شعری روایت اور دکنی کے شعری تجربے کا خوبصورت آمیزہ تیار ہوا۔ یہ ایک نئی جمالیات کی ابتداتھی۔حسن شوقی نے شعوری طور پر فارسی غزل کے طرز احساس سے دکنی یا مقامی حسیت،لغت اورحسن کے ابعاد کو آراستہ کیا۔شوقی،رستمی اور نصرتی کے رزم ناموں کو شہرت حاصل ہوئی۔ قصائد اور مثنویوں نے جدید اردو نظم کے لیے زمین کا کام دیا ہے۔تہذیب کے فروغ میں زبان اور زبان کے فروغ میں تہذیب کا کردار کلیدی ہوتا ہے۔تہذیبوں اور زبانوں کے ملنے سے ایک نئی تہذیب اور نئی زبان کا وجود عمل میں آتا ہے۔ایک طرف عربی، فارسی اور ترکی زبان تھی،دوسری طرف سنسکرت، پراکرت اور ہندوستان کی دیگر بولیاں اور زبانیں۔ باہمی میل جول سے ایک زبان وجود میں آئی جسے ہندوی، ہندی یا بھاشا کہا گیا جبکہ اس آپسی ارتباط سے جنم لینے والی تہذیب کو ہند اسلامی ہند ایرانی تہذیب کا نام دیا گیا۔اس تہذیب کی بنیاد حسن اور جمالیات کی دریافت ہے اور شاعری کا محور عشق ہے۔ اظہار کے دو بڑے موضوعات ہیں،یعنی بزم اور رزم۔انھی موضوعات کے متعلقات اپنے اصل اور ضمنی حوالوں کی روشنی میں بار بار اظہار کے لیے تحریک کا کام کرتے ہیں۔

دکنی روایات سے ہٹ کر شمالی ہند اور اردو شاعری کی پوری تاریخ میں اردو نظم کا سب سے پہلا بڑا نام نظیراکبرآبادی کا ہے۔ وہ مقامی رنگ اور عوامی روایت کے اہم ترین شاعر ہیں۔ اردو کی شعری روایت میں ان کی شاعری انقلاب سے کم نہیں۔مجلسی اقدار، رسوم وقیود،آداب والقاب اور درباری رنگ وآہنگ سے جدا ہو کر ایک آزاد اور عوامی زندگی کے مظاہر سے پیدا ہونے والے جذبات واحساسات کو نظم کا جامہ پہنانے کا سہرا اسی مرد فقیر کے سر جاتا ہے۔ان کے دور کی شاعری کلاسیکی رچاؤ کی پاسدار تھی۔ جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو نادرشاہی حملوں کی تباہیوں کے اثرات ان کی فکری تشکیل کے تانے بانے میں متحرک کردار ادا کر رہے تھے۔اس عہد کے آشوب میں پیدا ہونے والے ذہنی کرب کے نتیجے میں نظیر نے اپنے خاندان کے ساتھ دہلی سے آگرہ ہجرت کی۔انھوں نے بہت قریب سے حوادث زمانہ کا مشاہدہ کیا۔دنیا کے فریب اور زندگی کی بے ثباتی کا ادراک ان کے یہاں بے نیازی کی خصوصیات پیدا کر دیتا ہے۔شہر آگرہ ان کی شاعری کا مرکزی کردار ہے۔انھوں نے امرا کے دیوان خانوں، اعلیٰ مجلسوں اور خواص کے ادبی حلقوں سے شاعری کو نکال کر گلیوں،محلوں اور بازاروں سے گزارا۔اپنی نظموں میں ہندو مسلم اتحاد اور گنگا جمنی تہذیب کا فکری نمونہ پیش کیا۔گہرے فلسفوں کے بجائے عام زندگی کے معاملات نے انھیں متاثر کیا۔انھوں نے موسموں،تہواروں،میلوں ٹھیلوں اور کوچہ وبازار کی رونقوں سے اردو شاعری کا نیا منظر نامہ ترتیب دیا۔

جدید اردو نظم کے ظہور سے قبل نظم کی جو کلاسیکی روایات ہیں ان میں جدت اور تنوع کے عناصر موجود تھے۔نظم کے مزاج میں ایک سیکولر کردار موجود تھا۔شاہی جلوہ سامانیوں کے مقابل تصوف کا ادارہ تھا جو زمینی وابستگی اور باطن کی بصیرت کا ترجمان تھا۔ اردو نظم کے تہذیبی اور سماجی پس منظر میں رزم و بزم کے عناصر کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔

3.4 اہم خصوصیات

اردو نظم کا جو تہذیبی اور سماجی منظر نامہ ہے اس کے پس منظر کا مطالعہ ہمیں اس عہد کی تخلیقی سائکی کی تفہیم میں مدد بہم پہنچا تا ہے۔ شاعری کے تین بڑے موضوعات تھے۔ رزم، بزم اور تصوف۔ فارسی کی شعری روایت اور مقامی رنگ و آہنگ کے امتزاج سے ایک نئے اسلوب کی تعمیر ہوئی۔ یہ اسلوب لسانی اعتبار سے جتنا آزاد تھا، موضوع اور تجربے کے اعتبار سے بھی اس میں تنوع پیدا ہوا۔ نظیر اکبر آبادی نے اس اسلوب کو جاوداں بنا دیا۔ اب شاعری محض نشاطیہ تہذیب کی ترجمان نہیں رہی۔ اس میں اطراف کا مشاہدہ، ذات اور زمانے کا کرب بھی سمٹ آیا۔ اس لہجے کو عوامی رنگ یا اسلوب قرار دے کر اسے کم تر سمجھا گیا، لیکن آج تہذیبی اور سماجی حوالوں کی روشنی میں اس اسلوب کا کردار اپنی مستحکم بنیادوں پر کھڑا ہے۔

3.5 خلاصہ

قلی قطب شاہ سے قبل اردو میں بابا فرید، امیر خسرو اور کبیر کی شعری روایات موجود تھیں۔

قلی قطب شاہ نہ صرف اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں، بلکہ پہلا نظم نگار ہونے کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے

نظیر اکبر آبادی کی نظم ''بسنت'' کو ہندوستانی تہذیب کے سیاق میں خاص شہرت حاصل ہے۔

قصائد اور مثنویوں نے جدید اردو نظم کے لیے زمین کا کام انجام دیا ہے۔

نظیر اکبر آبادی اردو نظم کی تاریخ میں سب سے پہلے بڑے نظم نگار ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کی شاعری گنگا جمنی تہذیب، مقامی رنگ اور عوامی روایت کی آئینہ دار ہے۔

3.6 اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات

(۱) اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر تسلیم کیے گئے ہیں؟

(الف) ولی دکنی

(ب) سراج اورنگ آبادی

(ج) قلی قطب شاہ

(۲) قلی قطب شاہ سے پہلے کے شاعر ہیں؟

(الف) ملا وجہی

(ب) امیر خسرو

(ج) ولی دکنی

(۳) قلی قطب شاہ کے زمانے میں شمالی ہند پر حکومت کر رہا تھا؟

(الف) شاہجہاں

(ب) ہمایوں

(ج) اکبر

(۴) مقامی رنگ اور عوامی روایت کے شاعر ہیں؟

(الف) نظیر اکبر آبادی

(ب) ابن نشاطی

(ج) میر تقی میر

3.7 نمونہ امتحانی سوالات

(ا) مندرجہ ذیل میں سے ہر سوال کا جواب تقریباً تیس سطروں میں لکھیے۔

(الف) اردو نظم کے تہذیبی و سماجی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

(ب) کلاسیکی شعری روایات میں رزم و بزم سے کیا مراد ہے؟

(ج) نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری کا جائزہ لیجیے۔

(۲) کسی ایک پر نوٹ لکھیے۔

(الف) قلی قطب شاہ

(ب) نظیر اکبر آبادی

(ج) حسن شوقی

3.8 سفارش کردہ کتابیں

(ا)	اردو ادب کی تاریخ (ابتدا سے 1857 تک)	مصنف: ڈاکٹر تبسم کاشمیری
(۲)	دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر	مصنف: محمد حسن
(۳)	نظیر شناسی	مرتبین: مرزا اکبر علی بیگ، محمد علی اثر

بلاک ۔۲:

بلاک ۔۲ بھی تین اکائیوں پر مشتمل ہے۔ جس میں اکائی چہارم سے ششم تک شامل ہیں۔ اکائی چہارم 'اردو نظم اور ترقی پسند تحریک' پر مشتمل ہے۔ اردو ادب کے ارتقاء میں بھی مختلف تحریکات ور جحانات کا اہم کردار رہا ہے اور ہر تحریک نے ادب کو وسعت عطا کی ہے لیکن اردو ادب کو متاثر کرنے میں بالخصوص دو تحریکات کا ذکر ناگزیر سمجھا جاتا ہے جن میں پہلی ''علی گڑھ تحریک'' ہے جس کے روح رواں سر سید احمد خاں ہیں اور دوسری ''ترقی پسند تحرک'' ہے جس کی بنیادیں استوار کرنے میں سجاد ظہیر نے کارہائے نمایاں انجام دیا۔

پانچویں اکائی میں 'اردو نظم اور حلقۂ ارباب ذوق' کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ حلقے کے شعراء کی بدولت مغرب کی علامت نگاری، تاثریت، امیجزم، وجودیت اور سرریلزم سے اردو شاعری روشناس ہوئی۔ فرائیڈ کے نفسیاتی نظریات کے اثرات بھی اردو نظم میں دکھائی دینے شروع ہوئے۔ اس طرح اردو نظم نے انسان کے داخل کی کائنات کا عرفان بخشا۔

اکائی ششم میں 'اردو نظم اور انجمن پنجاب' پیش کیا گیا ہے۔ انجمن پنجاب کا قیام ایک تاریخی قدم تھا۔ کرنل ہالرائڈ اس انجمن کے سرپرست تھے اور انہیں کی صدارت میں ۱۸۶۷ء میں پہلی بار جلسہ ہوا جس میں مولانا محمد حسین آزاد نے 'نظم اور کلام موزوں' کے باب میں کافی اہم لکچر دیا۔

اکائی:4 ترقی پسند تحریک اور اردو نظم نگاری

ساخت

4.1 اغراض ومقاصد
4.2 تمہید
4.3 ترقی پسند تحریک
4.4 ترقی پسند تحریک کی نظم نگاری
4.5 نمونہ امتحانی سوالات
4.6 فرہنگ
4.7 سفارش کردہ کتابیں

4.1 اغراض ومقاصد

۱۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز ومحرکات کا علم حاصل کرسکیں گے۔
۲۔ ترقی پسند تحریک کی فکری بنیادوں کا علم حاصل کرسکیں گے۔
۳۔ ترقی پسند تحریک کی شعری خصوصیات کو جان سکیں گے۔
۴۔ ترقی پسند تحریک کے نظم نگاروں کی نظم نگاری کا علم حاصل کرسکیں گے۔

4.2 تمہید

سماجی اور ادبی تحریک سماج کے جمود کو توڑ کر اس میں حرکت وحرارت پیدا کرنے کا کام انجام دیتی ہے۔تحریکات کا وجود سماج کے لئے مختلف زاویوں سے اہم اور ضروری ہوتا ہے۔ادبی تحریک بھی ادب میں نئی سمت و رفتار پیدا کرتی ہے۔اردو ادب کے ارتقاء میں بھی مختلف تحریکات ور جحانات کا اہم کردار رہا ہے اور ہر تحریک نے ادب کو وسعت عطا کی ہے لیکن اردو ادب کو متاثر کرنے میں بالخصوص دو تحریکات کا ذکر ناگزیر سمجھا جاتا ہے جن میں پہلی ''علی گڑھ تحریک'' ہے جس کے روح رواں سر سید احمد خاں ہیں اور دوسری ''ترقی پسند تحرک'' ہے جس کی بنیادیں استوار کرنے میں سجاد ظہیر نے کارہائے نمایاں انجام دیا۔ترقی پسند تحریک ایک ادبی تحریک تھی جس نے ادب کا ''ادب برائے ادب'' کے بجائے ''ادب برائے زندگی'' کا نعرہ دیا۔اس تحریک کے مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ تھا کہ ادب کے ذریعہ کمزروں اور مظلوم طبقہ کی حمایت کی جائے اور ان کے حق میں آواز اٹھائی جائے۔لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ مذکورہ تحریک کے ذریعہ ادب کو سماجی اصلاح و بہبود کے لئے استعمال کئے جانے کا نظریہ پیش کیا گیا۔ترقی پسند تحریک نے نہ صرف ادب کے موضوعات کو نئی سمت عطا کی بلکہ ہیئت کو بھی نئے رنگ وآہن سے ہمکنار کیا۔اس طرح اس تحریک کے زیر اثر تخلیق کیا گیا ادب اردو ادب کو نئے زاویوں سے روشناس کرتا ہے۔

4.3 ترقی پسند تحریک

ادب سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ سماج میں چونکہ مسلسل تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اس لئے ادب میں بھی اسی اعتبار سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جب بھی کوئی تحریک وجود میں آتی ہے تو یہ اچانک نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے صدیوں پر محیط سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی پس منظر کا عمل دخل ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی ابتداء بھی انھیں عوامل کے مدنظر ہوتی ہے۔ حالانکہ اگر ادبی طور سے اس کی ابتدا کا وسیلہ تلاش کیا جائے تو اس کا راستہ علی گڑھ تحریک سے منسلک نظر آتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں تحریکات کے مقاصد میں فرق نظر آتا ہے۔ جہاں علی گڑھ تحریک سماجی، تعلیمی اور تہذیبی اصلاح پر زور دیتی ہے جس کا اثر ادب پر بھی پڑتا ہے وہیں ترقی پسند تحریک ایک ادبی وثقافتی تحریک کی حیثیت سے سامنے آتی ہے جس نے سماج کو متاثر کیا۔ کسی تحریک کی باضابطہ ابتدا کس طرح ہوا اس کی روشنی علی گڑھ تحریک سے ہی ملتی ہے۔ لیکن اس کی ابتدا کے تناظر میں سماجی نوعیت سے اگر نظر ڈالی جائے تو پورا ہندوستانی معاشرہ اور اس کا نظام اس کا سبب بنتا نظر آتا ہے۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب روس نے پوری دنیا کے مظلوم طبقے کو اپنے حقوق کے لئے کھڑے ہونے کا حوصلہ دیا۔ اس کے علاوہ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے امکانات نے غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں مقید عوام کے ذہن کو بیدار کرنے کا کام انجام دیا۔ اسی اثنا میں چند ہندوستانی نوجوان حصول تعلیم کے لئے لندن میں مقیم تھے جن میں سجاد ظہیر، انگریزی کے ناول نگار ملک راج آنند، بنگالی ادیب ڈاکٹر جیوتی گھوش اور پرمود سین گپتا اور اردو کے ادیب و شاعر ڈاکٹر محمد دین تاثیر شامل تھے۔ چونکہ یہ نوجوان خود ادیب و شاعر تھے اس لئے سماجی امور و مسائل پر ان کی گہری نگاہ تھی اور سماجی ناہمواریوں نے ان ادبا کے ذہن کو بہت متاثر کیا جس کے نتیجے میں ان لوگوں نے یہ طے کیا کہ کچھ ایسا کام کرنا ضروری ہے جس کے ذریعہ مظلوم، مزدور اور محنت کش طبقے کی فلاح ہو سکے۔ لہٰذا وہیں لندن کے دوران قیام ہی ۱۹۳۵ء میں سجاد ظہیر نے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی جس کا نام ''ہندوستانی ترقی پسند مصنفین انجمن'' رکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا ایک منشور تیار کیا گیا جس میں ادب کے مقاصد کی مع تفصیل وضاحت کی گئی۔ اس منشور کو بعد میں ہندوستانی ادیبوں کو بھی بھیجا گیا۔

ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی فضا ہموار کرنے کے لئے سجاد ظہیر نے بہت کوششیں کیں۔ ان کے علاوہ ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر ان کے ساتھ رہے۔ انھوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ہندوستان کے شہرت یافتہ ادیبوں اور دانشوروں کو اس تحریک میں شامل کیا جس میں فراق گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر تارا چند، شیودان سنگھ چوہان، سید وقار عظیم، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک جیسے ادبا و شعرا نے اپنا تعاون دیا۔ اس ضمن میں سجاد ظہیر نے ۱۹۳۶ء میں ''انگارے'' کی اشاعت کی جس کے ذریعہ ادب میں ہنگامہ خیز تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس مجموعہ میں دس افسانے اور ایک ڈرامہ شامل تھا۔ ان میں سجاد ظہیر (پانچ افسانے)، احمد علی (دو افسانے)، رشید جہاں (ایک افسانہ اور ڈرامہ) اور محمود الظفر کے دو افسانے شامل تھے۔ ان افسانوں میں اس وقت کے سماجی رسم و رواج، جنسی مسائل، مسائل نسواں جیسے موضوعات پر مشتمل افسانے شامل ہیں جن کے موضوعات کو لے کر بہت مخالفت بھی کی گئی لیکن یہ افسانے اپنے مقاصد کی تکمیل میں کامیاب رہے اور ترقی پسند ادب کی تخم ریزی میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔

''انگارے'' کے علاوہ اختر حسین رائے پوری کا مضمون ''ادب اور زندگی'' ادب کے نئے نظریات کو پیش کرتا ہے۔ اس مضمون نے ترقی پسند ادب اور اس کے مقاصد کی ترسیل میں اہم کردار کیا۔ ترقی پسند تحریک کی ترویج و اشاعت میں رسالہ ''نیا ادب'' نے بھی اہم رول ادا کیا۔ جس کا پہلا شمارہ ۱۹۳۹ء میں جاری ہوا تھا۔ بہت قلیل مدت میں ہی ترقی پسند تحریک کی شہرت ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی اور اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اس تحریک کے بانیوں نے ادبا و شعرا کی کانفرنس بلانے کا

ارادہ کیا۔ لہٰذا اس کی تکمیل کرتے ہوئے ۱۱ اپریل ۱۹۳۶ء کو ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس لکھنؤ کے رفاہ عام ہال میں بلائی گئی جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی۔ اس کانفرنس میں ان کے علاوہ مولانا حسرت موہانی، جے پرکاش نرائن، کملا دیوی چٹوپادھیائے، یوسف مہر علی وغیرہ نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں منشی پریم چند نے جو خطبہ دیا تھا وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا ایک حصہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

> ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کردے، سلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔''

جب ہندوستان ۱۵ / اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہو گیا۔ آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک کی چھٹی کانفرنس ۱۹۴۹ء میں منعقد ہوئی۔ اس میں جو اعلان نامہ پیش کیا گیا اس کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

> ''آج ہندوستانی ادب میں فیصلہ کن تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ آج ترقی پسند اور رجعت پسند رجحانات بہت زیادہ صفائی کے ساتھ ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے ہیں اس کشمکش میں اس جد و جہد کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو ہندوستان کی جنتا جمہوریت اور اشتراکیت کے لئے کر رہی ہے۔''
>
> ''ان حالات میں ترقی پسند ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اظہار خیال کے لئے جد و جہد کریں، جمہوری رسالوں کو باقی رکھنے کی پوری کوشش کریں اور عوام کے ساتھ مل کر معیار زندگی کو بڑھانے اور تعلیم و تہذیب اور تمدن کو آزادی کے ساتھ حاصل کرنے کی جد و جہد میں پورا حصہ لیں۔''

ترقی پسند تحریک کا نقطۂ نظر ادب کے موضوعات کے متعلق وہی ہے جو ان کے مختلف منشورات اور اعلان ناموں میں لکھا یا بیان کیا گیا ہے۔ ادب کو زندگی کا ترجمان بنانے میں اس تحریک نے اہم کردار ادا کیا اور حقیقتوں سے اس کو روشناس کرایا۔ اس تحریک کے زیر اثر جو بھی ادب تخلیق کیا گیا اس نے تحریک کے نظریات و ک فروغ دینے میں تعاون کیا۔ تحریک سے پہلے جو ادب تخلیق کیا جا رہا تھا وہ اجتماعیت اور سماجی مسائل سے محروم تھا لیکن ترقی پسند تحریک نے نہ صرف شعر و ادب کو نئی راہیں دکھائیں بلکہ موضوعات میں تنوع بھی پیدا کیا۔ اس کے تحت حقیقت پسندی کے ساتھ سنجیدہ ادب بھی پروان چڑھا جس کی اس وقت اشد ضرورت تھی۔ اس کی بنا پر افادیت اور ہمہ گیریت رفتہ رفتہ پورے ہندوستانی ادب میں داخل ہو گئی جس نے ادب کو انقلابی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ذہن اور فکر بھی عطا کی۔

4.4 ترقی پسند تحریک کی نظم نگاری

اردو میں ترقی پسند تحریک ایک بغاوت و انقلاب کی شکل میں ابھری اور تمام اصناف سخن اور اصناف ادب پر چھا گئی۔ خصوصی طور پر اردو نظم نے مقصدیت کے پیش نظر سماج، تاریخ، عہد اور ماحول کو ہی اپنا ہدف بنایا۔ ترقی پسند کے ابتدائی دور میں نوجوان شعرا کا کلام سب سے پہلے حیات اللہ انصاری کے ہفت روزہ اخبار ہندوستان لکھنؤ کے ذریعہ منظر عام پر آیا۔ اور اس زمانے کے رجحان پر سجاد ظہیر نے ایک مضمون ''اردو کی جدید انقلابی شاعری'' کے عنوان سے لکھا اور انھیں اس نام سے یاد کیا تھا۔ ان میں

سے بعض ترقی پسند شاعری میں نمایاں حیثیت کے مالک بنے جیسے اسرارالحق مجاز، معین احسن جذبی، علی سردار جعفری وغیرہ اور ۱۹۴۳ء میں کچھ شعراء منظر عام پر آئے جن میں سلام مچھلی شہری، علی جواد زیدی اور مسعود اختر جمال کے نام آتے ہیں۔ اسی گروہ میں رضی عظیم آبادی، شہاب ملیح آبادی، وقار انبالوی اور شمیم کرہانی وغیرہ بھی شامل ہوجاتے ہیں۔ اس دور کے نوجوان شعرا کے جذبات آزادی اور انقلاب سے معمور تھے اور وہ دنیا کا ہر عیش وآرام تج کر ایثار وقربانی کے لیے آمادہ تھے۔ اس ذیل میں شمیم کرہانی کی نظم ''قومی بیداری کا گیت، جوان جذبے، جگاوا''، شہاب ملیح آبادی کی نظم ''ہٹو آتا ہے مرد انقلابی'' اور علی جواد زیدی کی نظمیں بھی آتی ہیں۔

سلام مچھلی شہری نے انقلابی رومانیت، عشق ومحبت سے دامن چھڑا کر سرفروشی اور جاں بازی کو بنیادی طور پر اپنایا۔ سلام مچھلی شہری کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

مجھے نفرت نہیں ہے عشقیہ اشعار سے لیکن
ابھی اس کو 'غلام آباد' میں میں گا نہیں سکتا
مجھے نفرت نہیں ہے حسنِ جنت زار سے لیکن
ابھی تابِ نشاطِ رقصِ محفل لا نہیں سکتا
مجھے نفرت نہیں پازیب کی جھنکار سے لیکن
ابھی دوزخ میں اس جنت سے دل بہلا نہیں سکتا
ابھی ہندوستاں کو آتشیں نغمے سنانے دو
ابھی چنگاریوں سے اک گل رنگیں بنانے دو

اس دور کے شعراء محبوب کے وجود کے ضرور قائل ہیں لیکن محبوب، خم، گیسو، ابرو کے اسیر نہیں۔ اس لیے کہ وہ ایک بڑی جنگ اور کشمکش سے دوچار ہیں۔ سردار جعفری کی نظم ''انتظار نہ کرنا'' اس عہد کی یادگار ہے۔

میں تجھ کو بھول گیا اس کا اعتبار نہ کر
مگر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر
عجب گھڑی ہے اس وقت آ نہیں سکتا
میں تیرے سازمحبت پہ گا نہیں سکتا
میں تیرے پیار کے قابل نہیں ہوں پیار نہ کر
نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر

علی جواد زیدی کی نظم بھی اسی کیفیت کی ترجمان ہے۔ سلام مچھلی شہری بھی اسی طرح کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ ترقی پسند نظم نگاری نے انقلاب وبغاوت کو اپنا نصب العین بنایا اور ایک اچھے اور صحت مند سماج کے تصور کو جنم دیا۔ جس میں ظلم وجور، بربریت اور سفاکیت نہ رہے۔ کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے بلکہ مظلوموں اور مزدوروں کو بھی زندہ رہنے کا حق ملے۔ ترقی پسند نظموں میں غصہ، احتجاج اور انتظام کے شعلے بھڑک رہے ہیں، جو جاگیردارانہ اور فرسودہ نظام کو جلا کر خاکستر کردینا چاہتے ہیں اور ایک نئی دنیا اور نئے سماج کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔ اسرارالحق مجاز کی نظم ''انقلاب'' میں یہ شعلہ فشانیاں نمایاں ہیں۔

ختم ہوجانے کو ہے سرمایہ داری کا نظام

رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوشِ انتقام
گر پڑیں گے خوف سے ایوانِ عشرت کے ستون
خون بن جائے گا شیشوں میں شراب لالہ گوں
خون کے بونے کی جنگل سے ہوائیں آئیں گی
خون ہی خوں ہوگا نگاہیں جس طرف کو جائیں گی
جھونپڑوں میں خوں، محل میں خوں، شبستانوں میں خوں
دشت میں خوں، وادیوں میں خوں، بیابانوں میں خوں
اور اس رنگ شفق میں باہزاراں آب وتاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

برطانوی سامراج اوراس کے مظالم سے ترقی پسند شعراء کوبطور خاص جھنجھوڑ کرر کھ دیا تھا۔ان کے جذبات برانگیختہ تھے اور آزادیٔ وطن کے جذبہ سے سرشار تھے۔ یہ سرشاری ان تخلیقی کاوشوں میں نمایاں ہے۔نظموں میں وضاحت کے ساتھ اس جذبہ کی عکاسی ہوتی ہے۔

یہ کیا مے کے بدلے خون چھلکا تیرے شیشے سے
یہ کیا ساز ہے اک نغمۂ ماتم اٹھا ساقی
بغاوت کی ہوائیں چل اٹھیں شاید گلستاں میں
یہ پیمانے الٹ ساقی، یہ جامِ جم اٹھا ساقی
جو ممکن ہو تو تو بھی آج رنگیں جام کے بدلے
لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی
(جاں نثار اختر، نظم ساقی)

وقار انبالوی کی نظم ''انتقام'' سے شعر ملاحظہ ہوں:

کھائیں بھی مزدور کا مزدور پر غرائیں بھی
دن کو محنت بھی کرائیں رات کو رلوائیں بھی
بھوک سے مزدور کے بچے بھی بلکیں مائیں بھی
تف ہے سرمایہ پرستوں پر کہیں مٹ جائیں بھی
انتقام، اے انتقام، اے انتقام، اے انتقام
(وقار انبالوی، نظم انتقام)

شہاب ملیح آبادی کی نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

پیس ڈالوں گا، رگڑ دوں گا، مسل ڈالوں گا
سر غرور و کبر ونخوت کا کچل ڈالوں گا

اسی جذبے کی سرشاری میں جذبی نے نظم ''دعوتِ جنگ'' لکھی تھی جو ان کے مجموعۂ کلام میں شامل نہیں ہے۔ چند اشعار پیش

ہیں:

جن کے آگے ہاتھ کانپیں ان حسینوں کو نہ دیکھ
تو ہے جلادِ فلک زہرہ جبینوں کو نہ دیکھ
آسماں پر وار کر بڑھ کر زمینوں کو نہ دیکھ
اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ

اقبال کو باقاعدہ ترقی پسند نظم نگاری میں تو شامل نہیں کیا جائے گا مگر ان کا ذہنی رویہ شروع سے انقلابی رہا ہے۔ جس میں چیخ وپکار، للکار اور نعرے نہیں ہیں بلکہ ان کا لہجہ متین اور حکیمانہ ہے۔ ان کا سوز وساز اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اپنی فکر کو کسی اور تیور سے پیش کریں۔ اگر اس کے اظہار کے لیے کبھی غیظ وغضب کی ضرورت محسوس بھی ہوئی تو انھوں نے اپنے آپ کو پس پردہ رکھ کر جوش وخروش کو کلام میں شامل کیا ہے۔ برطانوی حکومت کی بربریت اور مشرقی تہذیب پر حملے کو وہ برداشت نہیں کر سکے ہیں اور ان کا انقلابی انداز نمایاں ہو گیا ہے۔

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہی اس جوہر کی برّاقی
ڈھونڈھ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام
وائے تمنائے کام، وائے تمنائے خام

اس سے واضح مثال کے لیے اقبال کی اس مشہور نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جس میں دنیا کے غریبوں کی مفلسی وبیکسی سے بے چین ہو کر فرمان خدا فرشتوں کے نام کے عنوان سے لکھی ہے۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے دور و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

مخدوم محی الدین کی نظم نگاری میں بھی یہی کیفیت ملتی ہے۔ ان کی نظم ''موت کا گیت'' اس جذبہ کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا
خونِ انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
مورِ بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا
وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کر دیں
قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں
زلزلے آؤ دہکتے ہوئے لاؤ آؤ
بجلیو آؤ گرجدار گھٹاؤں آؤ

آندھیو آؤ، جہنم کی ہواؤں آؤ
آؤ یہ کرہ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسئہ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں

بغاوت اور انقلاب کی لے جب خوں آشام ہونے لگی تو سجاد ظہیر نے اس نظم نگاری کے ہشت پہلوؤں کی طرف شعراء کو متوجہ فرمایا کہ:

> ''انقلاب کے اس خونیت صور میں رومانیت جھلکتی ہے۔ یہ ایک طرح کی ادبی دہشت انگیزی ہے۔ یہ ایک ذہنی جذباتی بلوہ ہے۔ جو ایک درمیانی طبقہ کے انقلاب پرست نوجوان کے لیے ابتدا میں شائد جائز ہو تو ہو، اس سے ایک اشتراکی شاعر کو دور رہنا چاہیے۔ واعظانہ اور خطیبانہ انداز بھی ہماری انقلابی نظموں میں کافی پایا جاتا ہے۔ یہ بھی پرانے طرز کی شاعری کا ایک ترکہ ہے جس سے ہم دامن چھڑا لیں تو اچھا ہے......بہتر تو یہ ہے کہ آپ کسی کو مخاطب نہ کیجئے، زمانے پر نظر ڈالیے، حالات کو سمجھئے اور چوکنا ہو کہہ ڈالیے اور یہ پامال موضوع اب ترک ہونے چاہئیں۔ ان میں بہت سی باتیں جوش کہہ چکے ہیں۔ آپ انھیں کیوں دہراتے ہیں۔'' (نیا ادب، خاص نمبر، جولائی ۱۹۳۹ء، اردو کی جدید انقلابی شاعری)

سجاد ظہیر کے اس مشورے کے بعد ترقی پسند شعراء نے اپنے افکار و نظریات کو زیادہ متوازن اور معتدل انداز سے پیش کرنا شروع کیا اور اپنے فکر اور فن کو مزید پختگی کے سانچے میں ڈھالا۔ اسی دور میں جب انقلابی اور بغاوتی نغمے گونج رہے تھے۔ سید مطلبی فرید آبادی نے ہریانہ کے کسانوں اور مزدوروں کی زندگی کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ ان کا طرز فکر اور اسلوب ہر اعتبار سے معتبر اور مقامی تشبیہات و استعارات کے استعمال سے ایک منفرد انداز پیدا کیا۔ ان کے دو مجموعے ''ہیاہیا'' اور ''پنہاری'' شائع ہو چکے ہیں۔ ایک منظوم ہریالی کی دھرتی کا سوندھا پن رچا بسا ہے۔ انھوں نے بڑے کامیاب گیت بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے بہت سی نظمیں بھی کہی ہیں لیکن ان کی سب سے کامیاب اور موثر نظم قحط بنگال ہے، جس کا عنوان ہے ''تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے''۔ اس نظم کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ میرا جی جیسا شاعر جو خالص فنی قدروں کا دلدادہ تھا اور فن کی مقصدیت اور اس کے سماجی وابستگی کا منکر تھا وہ بھی اس نظم کی شعریت اور تاثیر کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ تقسیم ہند کے بعد سید مطلبی فرید آبادی پاکستان ہجرت کر گئے اور وہاں کے گرد و پیش کے حالات کے پیش نظر انھوں نے اپنی مخصوص طرز ادا میں ایک نظم لکھی جو ان کی آخری اور شاہکار نظم قرار دی جاسکتی ہے۔ جس کا عنوان ہے ''بنجارہ پاکستان میں''

ترقی پسند نظم نگاروں میں علی جواد زیدی بھی شامل ہیں۔ ان کا اردو کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ بھی کافی وسیع تھا۔ بھوج پوری علاقہ سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کے یہاں مقامی اور ارضی بولیوں کی حلاوت بھی ملتی ہے۔ ان کی باغیانہ اور انقلابی نظموں میں بھی گھن گرج کے ساتھ گیتوں کی مٹھاس ملتی ہے۔ انھوں نے آزاد نظم کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ کی ہے۔ ان کی آزاد نظم ''لاش'' سننے کے بعد جو لوگ آزاد نظم نگاری کے معترض تھے وہ بھی اس کے قائل ہو گئے تھے۔ یہ نظم مہادیو دیسائی کی موت پر اظہار تعزیت کے طور پر لکھی گئی تھی۔ ۱۹۴۲ء کی تحریک بغاوت پر زیدی کی دو نظمیں بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ پہلی نظم ''دھارے کا موڑ'' ہے، جس کے چند بند ملاحظہ فرمائیں:

جمنا کی کمر لچک رہی ہے
تہ خانوں میں فوج مچل رہی ہے

طوفاں کی ہوس مچل رہی ہے
پانی کی نظر بہہ چکی ہے
کھیتوں کی زمین دھنس رہی ہے
بدمست پڑے ہیں راجہ رانی
گومحلوں کی نیو ہے پرانی
بےفکری پہ موت ہنس رہی ہے
لہروں نے سنبھال لی کدالیں
آغاز ہوئی نئی کہانی
شاید ہی بچے یہ راجدھانی
بےکار رہیں پتھروں کی ڈھالیں

علی جواد زیدی کی دوسری اہم انقلابی نظم ''ہولی'' ہے، جس میں آزادیٔ ہند کے مختلف پہلوؤں اور جدوجہد کو بڑی فن کارانہ خوبی سے نظم کیا گیا ہے۔ ان کی ایک نظم کشمکش بھی ہے جس کے چند اشعار پیش ہیں۔

گودی میں مہ وسال کی مچلوں کہ نہ مچلوں
آتے ہوئے آرام کا ڈر روک رہا ہے
منزل کی طرف باگ کو موڑوں کہ نہ موڑوں
کوئی مری ہر راہ گزر روک رہا ہے
میں منکر اوہام ہوں بولوں کہ نہ بولوں
حامی تو ہے واعظ بھی مگر روک رہا ہے
بڑھنے کا بھی امکان ہے رکنے کا بھی امکان
گرنے کا بھی امکان سنبھلنے کا بھی امکان
کیوں آئینے کا پھر رخِ روشن ہی نہ دیکھوں
کیوں کشمکش زیست کا مدفن ہی نہ دیکھوں

سلام مچھلی شہری نے انقلابی اور باغیانہ تیور کے ساتھ رومانی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعۂ کلام ''میرے نغمے'' ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ دو حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلا حصہ 'پھول' کے عنوان سے تھا دوسرا حصہ 'انگارے' کے عنوان سے تھا۔ سلام کی نظموں میں گلاب باڑی، سڑک رہی ہے، ڈرائنگ روم'' کافی مشہور ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں ان کا دوسرا مجموعہ منظر عام پر آیا جس میں جنگل کا ناچ، تتلیاں، مہینوں کے گیت اور اندیشہ اہمیت رکھتی ہیں۔ سلام نے اپنے فن کی بنیاد بغاوت پر رکھی تھی اور اس میں رومانوی انداز بھی شامل تھا۔ ان کے یہاں زندگی کے تجربات اور مشاہدے بڑی خوبی سے نظم ہوئے ہیں۔ سلام نے اپنے مجموعے میرے نغمے کے دیباچے میں یہ قطع بھی شامل کیا تھا جس سے ان کی نظموں کے مرکزی خیال کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

مجھے معاف ہو اے ناقد زبان وادب
قیودِ فن سے اگر دور ہوں مرے جذبات

تری کتاب میں شاید ادب برائے ادب
مری کتاب میں لیکن ادب برائے حیات
تو پھر ادب میں ابھی انقلاب کی خاطر
کہاں سے فرصتِ پابندیٔ قیود و نکات

ترقی پسند نظم نگاری میں مسعود اختر جمال ایک رومانی اور انقلابی شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند نظم کو رومان اور انقلاب کے تصور سے علیحدہ نہیں کیا ہے۔ ان کی انقلابی نظموں میں ''طرحِ نو اور آسمان'' بہت پُر تاثیر ہیں۔ ان نظموں میں للکار تو نہیں لیکن دبے پاؤں زنجیر کی جھنکار کی نغمگی ہے۔ ان کی نظم نگاری کا انداز سادہ و سلیس ہے۔ انھوں نے کثرت سے قطعات کہے ہیں مگر قطعات میں اختصار کے باوجود نظموں جیسے خیالات اور افکار نمایاں ہیں۔

ترقی پسند نظم نگار شعرا میں اسرارالحق مجاز نے بہت جلدی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ''آہنگ'' کے منظر عام پر آتے ہی ہر طرف چرچے ہونے لگے۔ مجاز کی رومانی شاعری میں انقلاب اور انقلابی شاعری میں رومانیت کا عنصر غالب ہے۔ ان کی نظموں میں ''آوارہ، اندھیری رات کا مسافر، رات اور ریل، نذر خالدہ، ایک جلاوطن کی واپسی، نوجوان خاتون سے، خوابِ سحر اور آہنگِ نو'' ایسی نظمیں ہیں، جو ہمیشہ اپنے رنگ و آہنگ کے باعث گنگنائی جاتی رہیں گی۔ ان کا وفور اور شعور انقلاب ہمیشہ دعوتِ انقلاب و بغاوت دیتا رہے گا۔ ملک کی زبوں حالی جس طرح آنسو بہا رہی تھی اسے مجاز نے اپنی نظم ''آوارہ'' بڑی خوبصورتی پیش کیا ہے۔

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ، جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں
مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطان وجابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں
بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

ترقی پسند تحریک کے تحت شاعری کرنے والے نظم نگاروں کے قافلے میں یوں تو جذبی بھی شامل ہیں لیکن وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ زندگی کی تلخیوں نے انھیں انقلابی بنا دیا تھا، جس کی مثال ان کی نظم ''میری شاعری اور میرے نقاد'' ہے۔ یہ ان کے تجربات کا نچوڑ ہے جس کی صراحت انھوں نے 'فروزاں' کے دیباچے میں کر دی ہے۔

''ہمارے لیے مارکسی نقطۂ نظر پیدا کرنا نہایت لازمی ہے۔ اگر ہم واقعی اپنے آپ کو ترقی پسندوں کا علمبردار

کہتے ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ مارکس کے نظریات کو رنگین یا پُر شوکت الفاظ میں نظم کر دیا جائے۔ایک شاعر کی حیثیت سے ہمارے لیے جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے، وہ زندگی یا زندگی کے تجربات ہیں، لیکن کوئی تجربہ اس وقت تک موضوع سخن نہیں بن سکتا جب تک اس میں شاعر جذبے کی شدت اور احساس کی تازگی کا یقین نہ ہو جائے۔'' (فروزاں، دیباچہ)

اسی لیے جذبی کے اندا بیان میں کہیں انتشار یا ابہام نہیں پیدا ہوتا اور وہ ادبی پیکر میں ڈھل کر دل کشی اور تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔مثال کے طور پر ان کی نظموں میں ''طوائف، موت، آزار، فطرت ایک مفلس کی نظر میں، منزل تک'' وغیرہ نشتریت کی وجہ سے ترقی پسند نظم نگاری میں ادبی سرمایے کی مستقل معنویت رکھتی ہیں۔

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری عمر اور عہد کے لحاظ سے جوش ملیح آبادی اور اختر شیرانی کے ہم عصروں میں ہیں لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان کی شاعری میں برگ و بار ترقی پسند شاعروں کے عہد میں ہوئی۔انھوں نے اس تحریک میں ابتدا سے ہی دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔وہ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے اردو شاعری میں داخل ہوئے اور ایک نئی آواز اور لب ولہجے کے طور پر پہچانے جانے لگے۔لیکن فراؔق نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ ترقی پسند نظم نگاری میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان نظموں میں ''ترانۂ خزاں، شام عیادت، آدھی رات، دھندلکا اور جگنو'' کے علاوہ ''دھرتی کی کروٹ، شاہ نامۂ آدم، ڈالر دیس، اور امریکی بنجارہ نامہ'' وغیرہ ہیں۔ان نظموں میں ترقی پسندانہ عناصر کو جدید اشاریت اور علامتی اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔جو فراق کا حصہ ہے۔ان نظموں میں ہندوستانی تمدن کو فطرت کے حوالے سے بہت خوبصورتی سے ڈھالا گیا ہے۔

اس ذیل میں جوش ملیح آبادی کا بھی ذکر کرنا لازمی ہو جاتا ہے گو کہ وہ بھی اقبال کی طرح باقاعدہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں تھے لیکن ان کی نظموں میں ترقی پسندانہ افکار و نظریات پہلے ہی سے ملتے ہیں۔جوش نے بغاوت و انقلاب سے پُر تاثیر نظمیں بہت لکھی ہیں لیکن ان کے غم و غصہ کی لہر زیادہ ہے۔لعنت و ملامت کی بوچھار زیادہ ہے۔سوز و گداز کم ہے۔غلاموں سے خطاب کرتے ہیں تو پکار کر کہتے ہیں:

اے ہند کے ذلیل غلامان روسیاہ
شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لیے نگاہ
اے امت شکستہ دل اور اے گروہ شل
کب سے بلا رہا ہوں تجھ کو سوئے عمل

اس ذیل میں ان کی نظم ''کسان'' بڑے معرکے کی ہے، جس میں کامیاب اور رومانی فضا کے ساتھ کسان کی مجبوری اور بے کسی کو بیان کیا گیا ہے۔

سرنگوں رہتی ہے جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کی محبت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ
جس کی عظمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ
جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کسل بل پر اکڑتا ہے غرور شہریار

دھوپ سے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منھ گھر کی جانب ہے رواں
اس سیاسی رتھ کے پہیئے پر جمائے ہے نظر
جس میں آجاتی ہے تیری کھیتوں کو روند کر
چھورہا ہے خوں چکاں آنکھوں کے نیچے بار بار
گھر کی ناامید بیوی کا شباب سوگوار
سیم وزر نان ونمک، آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

جوش کی نظموں میں ''بغاوت، ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام، آزادی، سہاگن بیوہ وغیرہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں جوش کی نظموں نے بہت اہم اور انقلابی رول ادا کیا ہے۔

ترقی پسند نظم نگاری کے اس سفر میں فیض مرکزی توجہ کے مالک ہیں، ان کا پہلا شعری مجموعہ ''نقشِ فریاد'' ۱۹۱۲ء میں منظر عام پر آیا، جس میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ وہ جب رومان سے حقیقت کی طرف ہجرت کرتے ہیں تو ان کی نظمیں ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ، رقیب، تنہائی، موضوع سخن، ہم لوگ، بول کہ لب آزاد ہے تیرے'' وجود میں آتی ہیں۔ ان نظموں میں اردو نظم نگاری کو ایک نئے آہنگ سے روشناس کرایا اور اس کے بعد اردو کے بہت سے شعراء فیض کی تقلید میں مصروف عمل رہے۔ نقش فریادی کے بعد فیض کے مجموعے دست صبا اور زنداں نامہ ان کے اسیری کے دور کی تخلیقات ہیں جس میں بغاوت اور انقلاب کی چنگاری پوشیدہ ہے۔ ''صبح آزادی، دو عشق، نثار میں تیری گلیوں کے، شیشوں کا مسیحا، زنداں کی ایک شام، یاد، ملاقات، اے روشنیوں کے شہر، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، دریچہ'' انتہائی پُر تاثیر نظمیں ہیں اور ترقی پسند نظم نگاری کو آب وتاب عطا کرتی ہیں۔ وہ اپنے عہد کی سماجی حقیقتوں کو بہت سلیقے سے آشکار کرتے ہیں۔

ادبی اعتبار سے انقلابی شاعری میں ایک ایسی آواز پیدا کی گئی جو غلامی سے نجات دلا سکے اور ظلم و بربریت کا مقابلہ کر سکے۔ مخدوم محی الدین رومان سے انقلاب کی دہلیز پر آئے۔ ان کی عشقیہ اور رومانی نظمیں بھی ایک تیور رکھتی تھیں، جن میں ''سجدہ، انتظار، محبت کی چھاؤں، نامۂ حبیب، وہ، نورس، پشیمانی'' اہم ہیں۔ ان نظموں میں جمالیاتی احساس کیفیت اور یک گونہ لذت ملتی ہے۔ ان کی انقلابی نظم جو بہت مشہور ہوئی وہ 'جنگ آزادی' ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی
محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی
دہقانوں کی مزدوروں کی
وہ جنگ ہی کیا وہ امن ہی کیا
دشمن جس میں تاراج نہ ہو

وہ دنیا، کیا جو دنیا ہوگی
جس دنیا میں سوراج نہ ہو
وہ آزادی، آزادی کیا
مزدور کا جس میں راج نہ ہو

مخدوم کی نظموں میں ایک سپردگی اور غنائیت بھی ہے۔ وہ انقلاب کا انتظار بھی نرالے انداز سے کرتے ہیں جیسے کہ کوئی خوش جمال محبوبہ کا منتظر ہو۔

حیات بخش ترانے اسیر ہیں کب سے
گلو کے زہرہ میں پیوست تیر ہیں کب سے
قفس میں بند تیرے ہم صفیر ہیں کب سے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار ہے کب سے
ابھی دماغ پہ قحبائے سیم وزر ہے سوار
ابھی رکی ہی نہیں تیشہ زن کے خون کی دھار
شمیم عدل سے مہکیں یہ کوچۂ وبازار
گزر بھی جا کہ ترا انتظار ہے کب سے

وہ ایک انقلابی سپاہی کی طرح ہیں، لیکن ان کے لہجے میں کرختگی نہیں۔ وہ غزل کی غنائیت سے نظم کو دل کش بنا دیتے ہیں۔ ان کی اسی طرح کی نظموں میں اندھیرا اور زلف چلیپا بڑے دل فریب مناظر رکھتی ہیں۔ مخدوم کی دوسری نظموں میں ''آتش کدہ، قمر، سپاہی، چارہ گر'' ان کے انقلابی اور رومانی تیور کا امتزاج پیش کرتی ہیں۔

سردار جعفری ترقی پسند تحریک میں ایک رضا کار اور افسانہ نگار کے طور پر شامل ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں ان کے افسانوں کا مجموعہ ''منزل'' زیور طبع سے آراستہ ہو کر آیا، لیکن انھوں نے بہت جلدی افسانہ نگاری کو ترک کر دیا اور شاعری کی طرف مائل ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء میں پریم چند نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں جو مقالہ پڑھا تھا اس کے اثرات سردار جعفری کی شاعری میں آسانی سے ملتے ہیں لہٰذا ان کے اثرات کے نتیجے کے طور پر انھوں نے دو نظمیں ''ایک سرمایہ دار لڑکی'' اور ''دیہاتی لڑکی'' لکھی۔ سردار جعفری ترقی پسند شاعروں میں سب سے زیادہ ذہین، خطیب اور طباع واقع ہوئے تھے۔ ان کا حافظہ اور مطالعہ دونوں بہت قوی اور وقیع تھا۔ ان کی ایک کامیاب نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو:

اک طرف اونچے اونچے محل
اک طرف جھونپڑی ہے
اک طرف گوشت کے اور چربی کے بورے دھرے ہیں
اک طرف سخت فولاد کے سخت اعصاب ہیں
اک طرف ظلم اور جبر کی قوتیں ہیں
اک طرف عدل انصاف کا زور ہے
اک طرف ماؤ ہے، اک طرف چیانگ ہے

اک طرف مارشل، اک طرف مالوقاف
اک طرف کالی فسطائیت، ایک طرف انقلاب
اک طرف ایلیٹ، اک طرف گورکی

اک طرف خامشی، اک طرف شاعری
(خون کی لکیر، ص:۲۲۲)

سردار جعفری کا یہ لہجہ ان کے لیے مخصوص ہو گیا اور ان کی نظموں ''سیلاب چین، آنسوؤں کے چراغ (ہندوستان کے شرنارتھیوں اور پاکستان کے مہاجرین کے نام پر)، موت، نیا ودھان، زنداں بہ زنداں، کوریا'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' اپنے عہد کا رزمیہ ہے جس میں توانائی اور صلابت فکر ہے۔ وہ ایک کامیاب اور مقبول نظم نگار کی حیثیت سے اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ''آؤ کہ ایک خواب بنیں، ایشیا جاگ اٹھا'' ان کی سرمایۂ افتخار نظمیں ہیں، جو ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

ترقی پسند نظم نگاری میں کیفی اعظمی کا اہم کردار رہا ہے۔ وہ ایک انقلابی ذہن کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی بھی ابتدا رومانی شاعری سے ہوئی مگر ترقی پسند نظریات نے انھیں باغیانہ شاعر بنا دیا۔ ان کی سبھی نظموں میں توانائی اور شعریت ہے۔

منجمد خون میں شعلے سے تپاں ہیں دیکھو
افقِ دار سے لاشیں نگراں ہیں دیکھو

ان کی نظموں میں ''گاندھی جناح کی ملاقات پر، سوویت یونین اور ہندوستان، سوئے برلن جارہی سرخ فوج، لال جھنڈے، پھینک دو، اے دیش بھگتو کیا کہا، قومی حکمران، ریاست'' وغیرہ کیفی کی اہم اور پرتاثر نظمیں ہیں، جن میں للکار اور قومی حمیت کو بیدار کرنے کا پیغام ہے۔ ان کی ایک کامیاب مثنوی ''خانہ جنگی'' بھی ہے، جس میں فرقہ وارانہ فسادات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ''شری رام کا دوسرا بن باس'' ایک ایسی نظم ہے جو ذہنوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دینے کی قوت رکھتی ہے۔ اس میں روحِ عصر سموئی ہوئی ہے۔ غرض کہ یہ کیفی کی انقلابی شاعری گہرا تاثر رکھتی ہے جو دلوں کو گرماتی اور برماتی ہے۔

اس قافلے میں جاں نثار اختر بھی شامل ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے اثرات قبول کر کے سیاسی اور سماجی حقائق کو بڑی فنکاری سے اپنی نظموں میں نظم کرنے لگے۔ ان کی ایک نظم خانہ بدوش کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شام کو سورج کی رنگت پڑ چکی ہے زرد سی
اڑ رہی ہے ہر طرف میدان میں اک گرد سی
بجھ چکی ہے آسماں پر ڈوبتے سورج کی آگ
ہر بگولہ گا رہا ہے خانہ ویرانی کا راگ
وہ فسردہ رنگ پتے، خشک مٹی، زرد گھاس
جا بجا وہ ٹاٹ سے نکلے لہو کے خیموں کے بانس
بھوک کے مارے مویشی ہڈیوں کے ڈھانچ سے
ذرہ ذرہ میں تپش دن کی سلگتی آنچ سے

ان کی انقلابی نظمیں ''بگولا، جہاں میں ہوں، یہ ہو کر رہے گا، شاعر ہمیں راستہ دکھا دے، میں ان کے گیت گا تا ہوں'' سماجی حقیقت نگاری کی اچھی مثالیں ہیں۔ ان کی اس طرح کی نظموں میں ''آخری پڑاؤ، یا نگ سی کی موجو، سجاد ظہیر کے نام، اور روس کو سلام'' بڑی جامعیت رکھتی ہیں۔ ان نظموں میں جاں نثار اختر کا انفرادی رنگ غالب ہے۔

ساحر لدھیانوی نے فلمی دنیا میں بھی اپنے باغیانہ اور انقلابی ذہن کو زندہ رکھا۔ ساحر کی نظموں میں لب و لہجے کی شادابی نے ایک خوش گوار فضا پیدا کر دی ہے۔ اس عہد میں معاشرے کے کرب کو ہمارے زخموں نے بڑی شدت سے جذب کر لیا ہے۔ اس گہرے احساس کے نتیجہ میں وہ سماجی اور ذہنی موضوعات پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ساحر لدھیانوی کی ایک نظم کے چند اقتباس ملاحظہ ہوں جو ان کے مایوس کن تجربات کے پرتو ہیں۔

سوچتا ہوں کہ محبت سے کنارہ کرلوں
دل کو بیگانۂ ترغیب تمنا کرلوں
ایک آزاد کو پابند بنانے کی ہوس
ایک بیگانے کو اپنانے کی سعیٔ موہوم
دور سرمایہ کی روندی ہوئی رسوا ہستی
درگہِ مذہب و اخلاق سے ٹھکرائی ہوئی
سوچتا ہوں کہ بشر اور محبت کا جنوں
ایسے بوسیدہ تمدن میں ہے اک کارِ زبوں

ساحر کے طرز میں جدت اور اشاریت ہے۔ اس میں ایک وضاحت، بے ساختگی اور برجستگی ہے، جو نوجوانوں کو پہلی فرصت میں متاثر کرتی ہے۔ ان کی سب سے مقبول اور مشہور نظم ''تاج محل'' ہے جو اپنے انفرادی رنگ کی کامیاب مثال ہے۔ ان کی دوسری کامیاب نظمیں ''گریز، چکلے، لمحۂ غنیمت، بنگال، کل اور آج، ایک تصویر رنگ، ایک شام، خودکشی سے پہلے، نور جہاں کے مزار پر، جاگیر، نیا سفر ہے پرانے چراغ گل کر دو، شکست زنداں'' ہیں، جن میں ان کا خاص اسلوب اور فنی پیشکش نمایاں ہے۔ ان کی ایک طویل نظم پرچھائیاں ہے جو اس موضوع پر سب سے اچھی نظم کہی جا سکتی ہے۔

اختر الایمان ایک گھائل آواز کے شاعر ہیں، ان کی نظموں میں چلبلا پن، تلخی اور تیز دھارے کی سی کیفیت ہے جو ہندوستان کے نوجوانوں کے جذبات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں ''ایک سوال، نئی صبح، خاک وخون، تاریک سیارہ، ایک کہانی، پندرہ اگست، آزادی کے بعد، غلام روحوں کا کارواں، پیمبر گل، جنگ، سوالیہ نشان، یوں نہ کہوں کہ، اندوختہ'' موجودہ عہد کی سیاسی و سماجی حقیقت کی عکاسی کرتی ہیں، جس میں گہری بصیرت اور تہہ داری ہے۔ خاک وخون کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

آپ ہوں میں نہیں انسان سے مایوس ابھی
ابھی پھوٹے ہیں شگوفے ابھی کمسن ہے بہار
شبنمی سبز لبادوں سے مہک آتی ہے
خاک وخوں توڑ ہی دیں گے کبھی دیرینہ خمار

احمد ندیم قاسمی کی نظموں میں پنجاب کی رومانیت کے ساتھ انقلاب کی لہریں نمایاں ہیں۔ وہ افسانہ نگار بھی ہیں اسی لیے ان کی نظموں میں افسانوی انداز ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی نظم ''انسان عظیم ہے خدایا'' جس میں انھوں نے ترفع

آدم کو گردانا ہے۔ ندیم کے مجموعۂ کلام شعلہ گل میں ایک نظم ''ظلم کے خلاف لڑنے والے فن کاروں کے نام'' باغیانہ اور انقلابی تصورات کی حامل ہے۔ شعلہ گل میں شعلہ افشانیاں اپنے شباب پر ہیں، ان کا ایک مجموعہ جلال و جمال ہے، جس میں کئی نظمیں قابل توجہ ہیں۔

شاد عارفی نے جاگیردارانہ ماحول کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ان کی نظم نگاری کا مجموعی تاثر درج ذیل شعر سے ہوتا ہے۔

وہ شاعرانِ فرار و رجعت حیاتِ نو کا پیام کیا دیں
جو شہر آشوب کے محل پر حسین و نازک غزل سنا دیں

شاد کی نظمیں اپنی تکنیک اور اسلوب اور طرزِ احساس کے اعتبار سے قابل توجہ ہیں۔ عام نظم نگاروں سے ان کا اندازِ بیان جداگانہ ہے۔ ان کی نظموں کا موضوع سماجی اور معاشرتی مسائل ہیں۔ ان کی نظموں کا خصوصی تنوع ایک صحت مند فضا پیدا کر دیتا ہے۔ شاد عارفی کی نظموں میں ''رنگیلے راجہ کی موت، پرانا قلعہ، ان اونچے اونچے محلوں میں، دم توڑتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کو بہت موثر انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام ''سماج'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ پیر دہقاں، پرانا کوٹ، دیہاتی لاری میں ان کا مخصوص طرز نمایاں ہے، جس میں ترقی پسندانہ عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

پرویز شاہدی نے جوش کی نظم نگاری کے اثرات کو قبول کیا ہے۔ ان کی نظموں میں خاصی شدت ملتی ہے۔ ''والگا کو سلام، یانگ سی کو سلام، خوش آمدید، پال رابسن کے نام، استالن، اجالا، رقص حیات، سائر مستقبل، ضیافت اور اے میری شیروانی'' خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ جس میں رمزیت اور برہنہ گفتاری دونوں کا امتزاج ہے۔

منیب الرحمٰن کی نظموں پر مغربی شعراء کے اثرات نمایاں ہیں۔ ''مہاتما گاندھی کی موت، رات ساکت ہے ستاروں کا سفر جاری ہے اور ساقی نامہ میں ترقی پسند تحریک کے بھرپور اثرات اجاگر ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کی ایک کلاسیکی صنف، شہر آشوب کو پیرایۂ اظہار کے طور پر اپنایا ہے۔ ایک نظم کے چند شعر پیش ہیں:

کمر خم ہے کسانوں کی ابھی تک
وہی اونچا زمینداروں کا سر ہے
جھکا رہتا ہے کشتِ غم پہ دہقاں
چلن اس کا یہی شام و سحر ہے
ہو روزِ عید یا ماہِ محرم
ہمیشہ بزم ماتم اس کا گھر ہے
یہی ٹھہرا اگر آئین ہستی
عجب کیا موت پر اس کی نظر ہے
مگر پھر چاہئیں پیسے کفن کے

عزیز حامد برنی کی نظموں پر جوش کی نظم نگاری کے اثرات ہیں۔ ان کی نظموں میں شدت پسندی کے ساتھ خلوص بھی شامل ہے۔ ادبی حلقوں میں اپنا منفرد مقام بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کی نظموں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو توجہ مرکوز کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔

موت تاریخ کے گرتے ہوئے ایوانوں میں
ابن آدم کو لہو چاٹ کے گھبراتی ہے
(تصویریں)
خوں ٹپکتا ہے در و بام کی پیشانی سے
ایک ویرانی لپٹ جاتی ہے ویرانی سے
(مادر گیتی)

ظہیر کاشمیری ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے ترقی پسند مصنفین کی تنظیم اور ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔انھوں نے اپنی نظموں میں عوامی اور بین الاقوامی مسائل کو بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ظہیر نے اپنے کو موضوعاتی اور سماجی مسائل کی طرف مرکوز رکھا ہے۔ان کی طویل نظم ایشیا کا یہ حصہ ملاحظہ ہو:

آج ارض تلنگانہ کے گوشے گوشے میں کمیون بننے لگے
آج خاکستر زندگی سے وہاں زندگی کے ہیولے ابھرنے لگے
آج بجھتے ہوئے آنسوؤں سے وہاں آب مہر جہاں تاب پیدا ہوئی
آج بھوکی ہوئی کھیتوں سے وہاں بزم سبزے کی سنجاب پیدا ہوئی
آج مرد تلنگانہ نیرنگِ فتح محبت دکھانے لگا
آج مرد تلنگانہ بے نان وجادا سے بیدر کے رشتے ملانے لگا

وامق جونپوری کی نظمیں انقلاب کی روح سے مضمر ہیں۔ان کی نظمیں ''مینا بازار اور بھوکا بنگال'' کافی پُر تاثیر ہیں۔دراصل ۱۹۴۲ء کا قحط بنگال، غذائی تاریخ کا ایک سانحہ ہے کہ جس نے سارے ہندوستان کو بے چین و بے قرار کر دیا تھا۔جو لوگ اس حادثے کا شکار ہوئے ان کے مصائب اور شدائد کا تصور کرنا بھی محال ہے۔ان مظلوموں کی فاقہ کشی اور حکومت کی بے رحمی و سنگدلی سے پورے ہندوستان میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔اس بلائے ناگہانی کا ذکر وامق نے بہت گہرے محسوسات سے نظم کیا ہے۔چند حصے ملاحظہ ہوں:

پورب دیس میں ڈگّی باجی پھیلا سکھ کا کال
دکھ کی اگنی کون بجھائے سوکھ گئے سب تال
جن ہاتھوں نے موتی رولے آج وہی کنگال رے ساتھی
آج وہی کنگال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال
پیٹھ سے اپنے پیٹ لگائے لاکھوں الٹے کھاٹ
بھیک منگائی سے تھک تھک کر اترے موت کے گھاٹ
جین، مرن کے ڈانڈ ملائے، بیٹھے ہیں چنڈال، رے ساتھی
بیٹھے ہیں چنڈال

ترقی پسند نظم نگاری یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ شعرا کی ایک طویل فہرست ہے۔اگر سب کا ذکر کیا جائے تو ایک طویل دفتر

ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اس فہرست میں جگن ناتھ آزاد، تیغ الہ آبادی، جمیل مظہری، حفیظ ہوشیار پوری، غلام ربانی تاباں، نیاز حیدر، مخمور جالندھری، معصوم رضا راہی، عزیز قیسی، رفعت سروش، نازش پرتا پگڈھی، شہاب جعفری وغیرہ وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ترقی پسند نظم نگاری کا یہ سفر اب بھی کسی نہ کسی شکل اور طور پر جاری ہے، جس پر جدیدیت کے اثرات نہیں پڑ سکے ہیں۔ جدیدیت خود دم توڑ چکی ہے۔ اس لیے ترقی پسند شعر و ادب اب بھی توانا ہے۔

4.5 نمونہ امتحانی سوالات

١۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کی ابتدا کا جائزہ لیجیے؟

٢۔ ترقی پسند ادبی تحریک کے مقاصد کو مع تفصیل بیان کیجیے؟

٣۔ اردو ادب پر ترقی پسند ادبی تحریک اثرات کا جائزہ لیجیے؟

٤۔ اردو میں ترقی پسند ادبی شعرا کی خصوصیات کا ذکر کیجیے؟

٥۔ ترقی پسند تحریک کے منشور کے نکات کو بیان کیجیے؟

4.6 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
جمود	ٹھہراؤ	حمایت	مدد
محکومی	غلامی	ناہمواری	نابرابری
تخم ریزی	بیج بونا، ابتدا کرنے کا عمل	رونما ہونا	ظاہر ہونا
منشور	دستاویز، حکم نامہ	ہمہ گیریت	ہر چیز پر چھایا ہونا
خرمن	کھلیان	فانوس	قندیل
جرس	گھنٹا	چیں بجبیں	ماتھے پر بل
تقدیس	پاکیزہ و مقدس بنانا	وسیع النظری	بلند خیالی

4.7 سفارش کردہ کتابیں

1. خلیل الرحمٰن اعظمی — اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

2. یعقوب یاور — ترقی پسند تحریک اوور اردو شاعری

3. سید سراج الدین اجملی — ترقی پسند تحریک اور اردو غزل

4. علی سردار جعفری — ترقی پسند تحریک کی نصف صدی

5. جمال نقوی — ترقی پسند تحریک، ادب اور سجاد ظہیر

6. محمد اشرف — ترقی پسند تحریک اور اردو فکشن

7. سید محمد عقیل — جدید اردو نظم نظریہ اور عمل

اکائی:5 حلقۂ ارباب ذوق کی نظم نگاری

ساخت

5.1 اغراض ومقاصد
5.2 تمہید
5.3 حلقۂ ارباب ذوق کی ابتدا
5.4 حلقۂ ارباب ذوق کی خصوصیات
5.5 حلقہ ارباب ذوق کی نظم نگاری
5.6 نمونہ امتحانی سوالات
5.7 فرہنگ
5.8 سفارش کردہ کتابیں

5.1 اغراض ومقاصد

۱۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے آغاز وارتقا کا جائزہ لے سکیں گے۔
۲۔ حلقہ اربابِ ذوق کے تاریخی ادوار کا علم حاصل کرسکیں گے۔
۳۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے شعری تصورات کیا تھا۔ان کا علم حاصل کرسکیں گے۔
۴۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی نظم نگاری کی خصوصیات کا اندازہ کرسکیں گے۔
۵۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے نظم نگاروں کی نظم نگاری کا جائزہ لے سکیں گے۔

5.2 تمہید

ترقی پسند تحریک نے عقلیت پسندی اور سائنسی شعور کے منظّم استعمال سے ادب کو انقلاب اور مستقبل کے لیے اشترا کی سماج کی تشکیل کا آلہ کار بنایا۔ترقی پسند شعرا کی شاعری نے عصری حالات کی ترجمانی کی اور عوام کو ان سماجی و مادی اقدار سے آگاہ کیا جو اشترا کی نظام کی برکت سے فروغ پا سکیں گی،اس طرح ادب پر سیاست کا غلبہ نمایاں ہوگیا۔نظم میں فرد کے نفس و روح اور اجتماع کی اخلاقی و روحانی اقدار کا ذکر کم از کم ہونا شروع ہوگیا۔چند شعرا کے استثنا سے شاعری میں روحانی بلندی اور ترفع کو فراموش کیا جانے لگا۔تو اس تحریک کے ہمنواؤں میں افتراق پیدا ہوا۔چنانچہ ۲۹/اپریل ۱۹۳۹ءکو ’’بزم داستان گویاں‘‘ وجود میں آئی (۶۸) جس کا نام بعد میں ’’حلقہ ارباب ذوق‘‘ قرار پایا۔اس حلقے میں ایسے شعراء شامل تھے جنھوں نے مغرب سے ابھرنے والی مختلف ادبی تحریکوں سے اثر قبول کیا اور مغربی ادب کی تقلید یں اردو نظم میں نئے مزاق سخن کی ترویج کی اجتماعی کوشش شروع کیں۔ حلقے کے شعراء کی بدولت مغرب کی علامت نگاری، تاثریت، امیجزم، وجودیت اور سرریلزم سے اردو شاعری روشناس ہوئی۔فرائیڈ کے نفسیاتی نظریات کے اثرات بھی اردو نظم میں دکھائی دینے شروع ہوئے۔اس طرح اردو نظم نے انسان کے داخل کی کائنات کا عرفان بخشا۔اس اکائی میں ہم حلقہ ارباب ذوق کی ابتداء کے محرکات اور اس کے شعرا کی نظم نگاری کا

جائزہ لیا جائیگا۔

5.3 حلقہ ارباب ذوق کی ابتدا

اردو نظم نے بہت سی کروٹیں بدلیں لیکن نظم ہر حال میں وسعتِ فکر اور عظمتِ فن کو پیش کرتی رہی۔ قدیم نظم نگاری میں جہاں میاں نظیر اکبرآبادی، حالی، آزاد وغیرہ نے سماجی حقیقت نگاری کو پیش کیا ہے، وہیں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ترقی پسند نظم نگاری نے ایک انقلاب پیدا کر دیا، جس میں سماج، تہذیبی شعور کے ساتھ سیاسی اور وطنی بیداری بھی شامل ہوگئی، جس کے نتیجے میں برج نرائن چکبست، اقبال، جوش، احسان دانش، سردار جعفری، وامق جونپوری، ساحر لدھیانوی، مجاز ردولوی وغیرہ وغیرہ کا فن منصۂ شہود پر آتا ہے۔ دراصل معاشرہ کے محسوسات اور فن کے مطالبات کا جائزہ بغیر اردو نظم کے ممکن نہیں۔ کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں انجمن پنجاب کے تحت اردو نظم نے جو مضامین پیش کیے وہ ایک نئی تعبیر تھے۔ نظم گو شعرا نے اپنا مواد اپنے دور کے تقاضوں سے حاصل کیا۔ تغیر پذیر عہد میں صحت مند اور حیات آفریں پیغام سے اردو نظم کو توانائی بخشی۔ علامہ اقبال نے آفاقی عناصر شامل کر کے نظموں کو باوقار بنا دیا۔ مذہب، مابعد الطبیعات، سیاست، معاشرت کے بنیادی نظریات پر بحث و تمحیص کر کے اردو نظم کو فکری صلاحیت عطا کی۔ اردو نظم میں مناظر فطرت اور روزمرہ کے سیاسی انسلاکات کو بھی قلم بند کیا۔ اصلاحی، تمدنی مسائل کے علاوہ لوگوں کو عمل کرنے اور زندگی کو مفید اور کارآمد بنانے کی پُر جوش تحریک سے نظمیں آراستہ پیراستہ ہوئیں۔ نظیر اکبرآبادی، چکبست، اقبال، سلیم، سرور جہان آبادی، عظمت اللہ خاں، صفی اور جوش ملیح آبادی وغیرہ نے جوش اور عمل کا پیغام دیا۔ انھیں اوصاف کے باعث اردو نظم نے مختصر مدت میں دنیائے ادب میں اپنی مخصوص جگہ بنالی۔

ابتدا میں حلقۂ ارباب ذوق کوئی علاحدہ تحریک نہیں تھی۔ لاہور کے چند اہل قلم یکجا ہو کر شعر و سخن کی بزم سجاتے رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ ایک ملک گیر تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ اسی زمانے میں ترقی پسند ادب کی تحریک بھی زوروں پر تھی۔ ادب اور زندگی کے بارے میں ان دو تحریکوں کے نقطہ ہائے نظر میں شدید اختلاف تھا کہ انھیں دو متوازی تحریکیں کہنا مناسب ہوگا۔ حلقۂ ارباب ذوق کا دائرۂ اثر نسبتاً محدود تھا مگر اردو ادب کے تخلیقی اور تنقیدی رویوں میں حلقے نے جو اضافے کیے ان سے قطع نظر ممکن ہی نہیں ہے۔

حلقۂ ارباب ذوق نے اپنی مساعئ جمیلہ سے صرف شعر و ادب لکھنے کی ترغیب دینے اور اس پر تنقیدی نقطۂ نظر سے اظہار خیال کرنے تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ ان کوششوں میں عملی صورتیں بھی پوری جزئیات سے ہمارے سامنے آتی ہیں اور یوں لگتا ہے کہ میراجی کی شمولیت کے ساتھ ہی اس طرح کا احساس اس حلقے سے متعلق اہل قلم میں پیدا ہو گیا تھا اور ان کوششوں کا اظہار ۱۹۴۱ء کی بہترین نظموں کے انتخاب اور اس کی اشاعت سے ملتا ہے۔ حالانکہ حلقہ ارباب ذوق کسی مخصوص نظریاتی پابندی کا قائل نہیں تھا لیکن علی سردار جعفری نے کتاب ترقی پسند ادب ص ۱۹۲ پر حلقے کے بارے میں لکھا ہے:

> ''ترقی پسند تحریک کے خزانے میں سیکڑوں کتابوں کا اضافہ ہو چکا تھا...... اسی زمانے میں ایک گروہ نے سر اٹھایا یہ ہیئت پرست، ابہام پرست اور جنس پرست ادیب تھے جن کے مشہور نمائندے میراجی، یوسف ظفر، ممتاز مفتی اور مختار صدیقی وغیرہ تھے۔ یہ ذہین اور ہوشیار ہوگ تھے جو یورپ کے انحطاطی ادب سے متاثر تھے اور شعور کے بجائے تحت الشعور اور لاشعور پر اور معنویت اور مواد کو چھوڑ کر ہیئت اور اسلوب پر زور دیتے تھے۔ یہ لوگ کھلم کھلا ترقی پسند تحریک کے مخالف اور اس کا اعلان کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے اپنی ایک الگ انجمن حلقہ ارباب ذوق کے نام سے قائم کر لی تھی، جو لاہور اور دہلی تک محدود تھی لیکن ترقی پسند تحریک سے زیادہ منظّم تھی۔''

حلقۂ ارباب ذوق نے ''۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں'' کے عنوان سے انتخاب شائع کیا۔ اس کے پیش لفظ میں میراجی جو اس انتخاب کے مرتب تھے یوں وضاحت کرتے ہیں:

''چونکہ شعر ہی ادب کی بلندترین اور پائیدار صورت ہے اس لیے انتظامی کمیٹی کی تجویز کے مطابق نظموں کے انتخاب، ترتیب اور متعلقہ مضمون کے لیے وجود میں لائی گئی۔''

اس مجموعہ میں کل ۲۴ نظمیں ہیں اور ان کی ترتیب کچھ یوں ہے:

ازلی مسرتوں کی ازلی منزل- احمد ندیم قاسمی، انتباہ-فیض احمد فیض، رات کی بات-مختار صدیقی، نفسیات-عظیم قریشی، خودکشی-ن م راشد، تو نگر واپس نہ آتی-جوش، جواب تغافل-عدم، بنی آدم-قیوم نظر، چاندنی-تخت سنگھ، میراث-مقبول حسین احمد پوری، پسپائی-شریف کنجاہی، ننھا قاصد-اختر شیرانی، ڈرائنگ روم-سلام مچھلی شہری، تیرے ہی بچے تیرے ہیں بالے-مطلبی فریدآبادی، انوکھا پیار-مخمور جالندھری، دسہرہ اشنان-شاد عارفی، دھوبی کا گھاٹ-میراجی، نقشِ پا-اختر الایمان، جنت کی سیر-مہدی علی خاں، حسینہ کی موت-سعید احمد اعجاز، رقص-یوسف ظفر، خاکے-وشوامتر عادل۔

اس کے بعد حلقۂ ارباب ذوق کی مجلس انتخاب نے ''۱۹۴۲ء کی بہترین نظمیں'' کے پیش لفظ میں لکھا تھا۔ ''۱۹۴۱ء سے چلتا ہوا یہ کارواں بتدریج افسردگی اور اداسی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ افسردگی منزل ہے یا سنگ میل۔ اس کا فیصلہ مستقبل کے ہاتھ میں ہے۔''

دراصل اگر دیکھا جائے تو اس بات کا فیصلہ کرنا آسان نہیں۔

5.4 حلقۂ ارباب ذوق کی خصوصیات

۱۹۴۱ء کے بعد اردو نظم میں بتدریج ارتقا ہو رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم، کساد بازاری، مشترکہ خاندانوں کے شیرازہ کا منتشر ہونا اور اس کے نتیجے میں ذات اور انفرادیت کی لے کا عام ہو جانا، یہ ایک حقیقت ہے جس سے افسردگی نظر آتی ہے۔ حالات کے تغیرات نے شاعر کے یہاں افسردگی اور غم ورنج کی کیفیت ضرور طاری کی ہے۔ پھر بھی اردو نظم نے ۱۹۴۱ء کے بعد اپنی جہت بھی دریافت کر لی تھی۔ جس میں ظاہر سے باطن کی طرف آنے کی جہت نمایاں تھی۔ اس جہت کو اپنانے والے کے یہاں کم مائیگی، تنہائی، خوف اور اس کے نتیجے میں غم اور اداسی کا پیدا ہو جانا بالکل فطری تھا۔ انسان جب بھی اپنی ذات کی تلاش وجستجو میں غوطہ زن ہوا ہے تو اسے ایک ازلی وابدی غم سے ضرور دوچار ہونا پڑا ہے۔ یہ غم ایک ازلی اور ابدی غم کا رازدار بھی ہے جس میں شدید احساس فنا کا کرب واضطراب ہے۔ اور اسے ایک حد تک فرار کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ موت کی طرف بڑھنے اور موت سے فرار حاصل کرنے کے ان دو متضاد رجحانات نے شاعر کے یہاں ایک نفسیاتی تصادم پیدا کیا ہے۔ یہ تصادم میراجی کے بعد نظموں میں پوری طرح موجود ہے۔ اردو نظم میں ''موت'' ایک مرکزی موضوع رہا ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق کے زیر اثر نظموں میں یہ کیفیت اجاگر ہے۔ شاعر ایک تماشہ بین نہیں بلکہ خوف کے کرب سے گزرتا ہوا ایک انسان ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق کی نظموں کے چند نمونے پیش ہیں۔

ایک کندہ جیون کی رفتار رتوں کے سنگ
تیرا سہانا دیس، برستی برف، کھنکتے ساز
ایک کنارے، امرت پیتے، جیتے جگوں کی اوٹ
میری آخری سانس کی دھیمی، بے آواز، آواز

(مجید امجد - ایک فوٹو)

میں ہوں ایسا پات ہوا میں پیڑ سے جو ٹوٹے اور سوچے
دھرتی میری گور ہے یا گھر، یہ نیلا آکاش جو سر پر
پھیلا پھیلا ہے اور اس کے سورج، چاند ستارے مل کر
ایک ایک کر کے کھو جائیں گے، جیسے میرے آنسو اکثر
پلکوں پہ تھراتھرا کر تاریکی میں کھو جاتے ہیں
جیسے بالک مانگ مانگ کر لیے کھلونے سو جاتے ہیں

(اختر الایمان - بلاوا)

شفق کی سرخی بھی رفتہ رفتہ دھوئیں میں تحلیل ہو چکی ہے
میں آج ان برف سے ڈھکی وادیوں کے اس پار جا رہا ہوں
وہاں جہاں اس خطرِ پراسرار کے ادھر چند چوٹیاں ہیں
جہاں ہمیشہ سے برف ہی برف ہے بہار و خزاں نہیں ہیں
کہ موت آغوش وا کیے اس جگہ مری راہ تک رہی ہے
مگر خدا جانے زندگی کس لیے ابھی تک جھجک رہی ہے

(سید ضیاء جالندھری - زمستاں کی ایک شام)

یہ قلزم بیکراں، یہ موجیں
یہ وقت کا دھیرے دھیرے آغوش نیستی میں سمٹے جانا
میں ہر گھڑی دور ہوتا جاتا ہوں اپنی دنیائے آرزو سے

(منیب الرحمٰن - سمندر)

یہ تیرگی
اور ہر گھڑی بڑھتی ہوئی
اس کی انوکھی دلکشی
جیسے سکوں کے بحرِ بے پایاں کی حامل ہے یہی
دنیا کی منزل ہے یہی

(قیوم نظر - الجھن)

اگر سفر سے مفر نہیں ہے تو قیدِ منزل کا ذکر کیا ہے
کوئی بہار و خزاں مری راہ میں نہ آئے گی، چل رہا ہوں
عمیق غاروں میں ڈھل رہا ہوں

(یوسف ظفر - بازگشت)

جب ڈھلا سورج ترے تپتے، چمکتے پیار کا

تاحدِ احساس، تاحدِ قیاس
ذہن سے دل اور دل سے روح کے بے انتہا پھیلاؤ تک
رنگ پھیلے، حسرتوں کے رنگ، لاتعداد رنگ
اس شفق، اس سرخی، خونِ تمنا، میں وہ وحدت تھی کہ میرا الگ الگ
دکھ کی بے انداز، بے آواز بڑھتی سرد سنولاہٹ کی دہشت سے بھی لذت گیر تھا
اور میں یہ سوچ کر خوش تھا کہ ایسی لذت غم ناک، ایسا جھٹپٹا
اس قدر غمگین، اداسی، اس قدر دیگر انجام، نشاطِ دل ہوا کس کو نصیب
(ظہور نظر-لذتِ افتاد)
ہوا تیز تر ہو گئی
سرافراختہ پیڑ کے گرد پھیلے سمندر میں طوفان لپکنے لگا
سرافراختہ پیڑ تھرا اٹھا، نرم شاخوں کی چیخوں سے افلاک کا سینہ پھٹنے لگا
سمندر کا طوفاں اچھوتی بلندی سے آنکھیں ملانے لگا
سرافراختہ پیڑ کے پاؤں اکھڑے تو وہ سرنگوں ہو گیا
سیل میں کھو گیا
(عارف عبدالمتین-طوفان سے پہلے طوفان کے بعد)
چاروں سمت اندھیرا گھپ ہے اور گھٹا گھنگور
وہ کہتی ہے، کون؟
میں کہتا ہوں ''میں''
کھولو یہ بھاری دروازہ
مجھ کو اندر آنے دو
اس کے بعد اک لمبی چپ اور تیز ہوا کا شور
(منیر نیازی-صدا بصحرا)
کب تلک خشک ساحل پہ بیٹھے ہوئے
آتی جاتی صداؤں کے نوحے سنیں
کیوں نہ اتریں سمندر کے غاروں میں ہم
کیوں نہ یہ خاک کی سرزمیں چھوڑ دیں
(شہزاد احمد- کیمیا)
آئے گا آئے گا کوئی شہاب ثاقب
اسی کے دامن میں دہکتے ہوئے انگاروں کی چادر کا اک آنچل ہی سہی
میں تماشائی سہی آج تری خلوت کا

میری اس حیرتِ طفلی پہ نہ جا
ماں! تجھے گھورتے رہنے کا خطا کار ہوں میں
(حامد عزیز مدنی - مادرِ گیتی)
برف کی پتیاں رک رک کے بکھر جائیں گی، گر جائیں گی
اور دھندلکے کی خموشی میں سیہ بادل سے
برف پھر بہتی ہوئی آئے گی
دور تاریک درختوں کے تنوں سے آگے
نیم جاں جسم سے پیراہن صد چاک کو لپٹائے ہوئے
صبح کی پیرزنِ حسن فراش
کانپتے ہونٹوں سے دیوانی ہنسی ہنسنے کو ہے
برف پھر گرنے کو ہے
(صفدر میر - برف باری)
یہ سرگوشیاں کہہ رہی ہیں اب آؤ کہ تم کو بلاتے بلاتے
مرے دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
کبھی ایک پل کو کبھی ایک عرصہ صدائیں سنی ہیں مگر یہ انوکھی ندا آ رہی ہے
بلاتے بلاتے کوئی نہ اب تک تھکا ہے نہ آئندہ تھکے گا
''مرے پیارے بچے''، مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ دیکھو اگر یوں کیا تو برا مجھ سے
بڑھ کر نہ کوئی بھی ہوگا۔ خدایا، خدایا
کبھی ایک سسکی، کبھی اک تبسم، کبھی صرف تیوری
مگر یہ صدائیں تو آتی رہی ہیں
انھیں سے حیاتِ دوروزہ ابد سے ملی ہے
مگر یہ انوکھی صدا، جس پر گہری تھکن چھا رہی ہے
ہر اک صدا کو مٹانے کی دھمکی دیے جا رہی ہے
اب آنکھوں میں جنبش نہ چہرے پہ کوئی تبسم نہ تیوری
فقط دکان کستے چلے جا رہے ہیں
یہ اک گلستاں ہے، ہوا لہلاتی ہے، کلیاں چٹکتی ہیں، غنچے لہکتے ہیں
اور پھول کھلتے ہیں، کھل کھل کے مرجھا کے گرتے ہیں
اک فرش مخمل بناتے ہیں جس پر
مری آرزوؤں کی پریاں عجب آن سے یوں رواں ہیں
کہ جیسے گلستاں ہی اک آئینہ ہے

اس آئینے میں ہر اک شکل نکھری، سنور کر مٹی اور مٹ ہی گئی، پھر نہ ابھری
یہ پربت ہے خاموش! ساکن
کبھی کوئی چشمہ ابلتے ہوئے پوچھتا ہے کہ اس کی چٹانوں کے اس پار کیا ہے؟
یہ صحرا ہے، پھیلا ہوا خشک بے برگ صحرا
بگولے یہاں چند بھوتوں کا عکس جسم بنے ہیں
مگر میں تو دو ایک پیڑوں کے جھرمٹ پر اپنی نگاہیں جمائے ہوئے ہوں
بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تھکا ہے نہ شاید تھکے گا
تو پھر یہ ندا آئینہ ہے فقط میں تھکا ہوں کسی کو بلاتے بلاتے
(میراجی-سمندر کا بلاوا)
ایک لمحے کے لیے دل میں خیال آتا ہے
تو مری جان نہیں
بلکہ ساحل کے کسی شہر کی دوشیزہ ہے
اور تیرے ملک کے دشمن کا سپاہی ہوں میں
(ن م راشد-بیکراں رات کے سناٹے میں)
میرا عزم آخری ہے یہ کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج
آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب
(ن م راشد-خودکشی)
نہیں اس دریچے کے باہر تو دیکھو
خدا کا جنازہ لیے جارہے ہیں فرشتے
(ن م راشد-پہلی کرن)

5.5 حلقۂ ارباب ذوق کی نظم نگاری

حلقۂ ارباب ذوق نے اردو نظم کو ایک نئے انداز و آہنگ سے ہم کنار کیا ہے۔ میراجی، ن م راشد، تصدق حسین خالد وغیرہ نے اس کو مہمیز کیا۔ دراصل جدید اردو نظم میں فراز سے نشیب کی طرف لڑھکنے کا آغاز میراجی سے ہوتا ہے، لیکن میراجی نے اپنی تخلیقی قوتوں سے تحفظ ذات کی کوشش بھی کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ میراجی سے اردو نظم کی ایک نئی جہت کا آغاز ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ جہت کسی روشن مستقبل کی نشاندہی نہیں کرتی ہے۔ ان کی نظم نگاری باہر سے اندر کی طرف ہے اور یہی ان کی بنیادی جہت کہی جاسکتی ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے جب شخصیت سے فرار کو شاعری کے لیے ضروری قرار دیا تھا تو اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ اگر جذبہ اپنی بوجھل کیفیات سمیت فن میں داخل ہوگا یا شاعر کے نجی حالات اور واقعات بجنسہٖ شعر کا موضوع قرار پائیں گے تو لازمی طور پر فن اس سے مجروح ہوگا۔ یہ ساری الجھنیں شخصیت کے لفظ کو اس کی محدود حیثیت میں استعمال کرنے سے پیدا ہوئیں ورنہ

اگر شخصیت کو وسیع تر معنوں میں استعمال کیا جائے تو ذہن شاعر کے نجی حالات و واقعات کے بجائے اس کی ''ذات'' کی طرف منتقل ہوگا۔ لیکن شعرا نے اس کے مختلف اثرات پر غور نہیں کیا اور اس کی تعبیرات میں بھٹک گئے۔ میرا جی کی داخلیت پسندی کے رجحان نے جو اثرات اردو نظم پر ثبت کیے انھیں دو زاویوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ میرا جی کے بعد اردو نظم کو شعراء نے کس حد تک ان اثرات کو قبول کیا۔ دوسرے اس اعتبار سے کہ اس دور کے بعض شعرا نے اس تصادم اور آویزش کو کس ردعمل کے طور پر دیکھا یا اپنایا۔ جدید اردو نظم میں داخلیت پسندی کے علم بردار شعراء کی تخلیقات پچھلے تقریباً نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ن م راشد کے یہاں بے اطمینانی کی لہر نسبتاً زیادہ شدید ہے۔ یہ بے اطمینانی اور داخلی دونوں سطحوں پر اجاگر ہے۔ راشد نے فرد کو اپنی ذات کے اظہار کی طرف مائل کر کے نظم کی داخلیت پسندی کے رجحان کو تحریک دی، لیکن ان کے یہاں برہمی اور تخریب کا انداز شعور کی سطح سے نیچے نہیں جاسکا۔ ان کے یہاں فرد، یکا یک جاگ تو نہیں اٹھا ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کچی نیند سے بیدار ہو گیا ہو۔ اور اب برہم ہو کر ہر شے کو توڑنے پھوڑنے پر تل گیا ہو۔ اب صورت حال یہ ہے کہ خارجی زندگی کے جن پہلوؤں کے خلاف راشد نے جہاد کیا وہ زمانے کی ایک کروٹ سے مٹ چکے ہیں اور یوں اب راشد کے جہاد کی عمومی اپیل بھی ازخود ختم ہوگئی ہے۔ باایں ہمہ راشد کی یہ دین کچھ کم نہیں کہ اس کے یہاں سماج اور ماحول سے سمجھوتہ کرنے والا ایک پرزے کی طرح مشین میں کام کرتے رہنے کا رجحان نہیں ابھرا بلکہ اس کی نظموں میں ایک کراہ، دلخراش چیخ، تڑپتے ہوئے انسان کی بے کسی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی نظم کی دی گئی مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے جو اس کے قبل دی گئی ہیں، یہی حال میرا جی کی نظموں کا بھی ہے، جو بہت پہلودار ہیں۔ مثال میں دی گئی میرا جی کی نظم ایک طرف تو اس میں شاعر کو سمندر، موت یا ماں اپنی طرف بلاتی ہے اور دوسری طرف خود شاعر کے یہاں موت یا ماں کی آغوش میں جانے کی آرزو ابھرتی ہے۔ اس نظم میں کرب انگیز داخلی تصادم کو بڑے فن کارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

میرا جی کی نظموں میں جنس کا موضوع بہت نمایاں ہے۔ بعض لوگوں نے اس سلسلے میں نفسیات سے میرا جی کے گہرے شغف اور ملارمے وغیرہ کے اثرات کا ذکر بھی کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نظم میں کسی خاص رجحان کی لُو کبھی اکتسابی نہیں ہوتی اس کا گہرا تعلق شاعر کی ذات سے ہوتا ہے۔

بہر کیف اردو نظم پر حلقۂ ارباب ذوق کے اثرات بھی واضح ہیں۔ میرا جی کے بعد ایسے شعرا کی طویل تعداد ہے جن کے یہاں باہر سے اندر کی طرف آنے کی نہج بہت واضح اور نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر یوسف ظفر، مجید امجد، اختر الایمان، مختار صدیقی، قیوم نظر، ضیا جالندھری، جذبی، منیب الرحمٰن، انجم رومانی، محمد صفدر، وشوامتر عادل، سید فیضی، منظر سلیم، سلام مچھلی شہری، مخمور جالندھری، سردار نواز، الطاف گوہر، ابن انشا، منیر نیازی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

اب حلقۂ ارباب ذوق کے اثرات تو کم ہو گئے ہیں لیکن اردو نظم نگاری کو جو ایک نئی جہت یعنی داخلیت پسندی کا رجحان جو اس حلقہ نے دیا تھا اس سے اردو نظم نے بڑے تجربات اور مشاہدات اور ذاتی حوالے سے بہت فکر انگیز پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ اور قوت اظہار بخشا ہے۔ جو ایک اہم تاریخی موڑ کی طرف اذہان کو متوجہ کرتا رہے گا۔ اس سے انکار نہیں کہ حلقۂ ارباب ذوق سے منسلک شعرا نے اردو نظم نگاری میں کچھ جہتیں پیدا کی ہیں اس لیے کہ میرا جی، ن م راشد، تصدق حسین خالد، مختار صدیقی، مجید امجد وغیرہ نے ایسے عناصر کو اپنانے کی کوشش کی ہے جس کی ادبی نوعیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور ایک مستحسن قدم کہا جاسکتا ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق کے شعری کارناموں اور ہیئت و اسلوب کے بہترین عناصر کو جذب کر کے نظم نگاری میں کچھ دلچسپ اور پُر تاثیر پہلو کی طرف کوشش کی جاسکتی ہے کیونکہ اس حلقے کی نظموں میں ایک تخلیقی کرب ضرور ملتا ہے۔ اس میں فرد

اور معاشرے کے تصادم کی تصویر بھی نمایاں ہیں۔ بعض نظموں میں فلسفیانہ افکار اور جمالیاتی پیرایۂ اظہار کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ یہ سب زیادہ تر کٹر نظم گو شاعر ہیں لیکن ریزہ خیالی، انتشار، تکرار اور منجمد پیرایۂ بیان بھی جگہ پا گیا ہے اور براہ راست شاعری کا رجحان ملتا ہے جس میں سماج اور سماجی حقیقت نگاری بہت کم نظر آتی ہے۔ اس حلقے کی نظموں میں اجتماعی سماجی مسائل شاذ و نادر ہیں۔ زیادہ تر مغربی شعراء اور فن کاروں کے اثرات ہیں، جس سے زمینی رشتے اور زمینی سچائی مفقود ہو گئی ہے۔ اسی لیے اب حلقۂ ارباب ذوق اردو تاریخ شعر و ادب کا ایک حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ بقول سردار جعفری:

''اس زمانہ میں ایک اور گروہ نے سر اٹھایا یہ ہیئت پرست، ابہام پرست اور جنس پرست ادیب تھے۔ جن کے مشہور نمائندے میراجی، یوسف ظفر، ممتاز مفتی اور مختار صدیقی وغیرہ تھے۔ یہ ذہین اور ہوشیار لوگ تھے جو یورپ کے انحطاطی ادب سے متاثر تھے اور شعور کے بجائے تحت الشعور اور لاشعور پر اور معنویت اور مواد (Matter) کو چھوڑ کر ہیئت اور اسلوب پر زور دیتے تھے۔ یہ لوگ کھلم کھلا ترقی پسند تحریک کے مخالف تھے اور اس کا اعلان کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے اپنی ایک الگ انجمن حلقہ ارباب ذوق کے نام سے قائم کر لی تھی۔ جو لاہور اور دہلی تک محدود تھی۔ لیکن ترقی پسندوں کی تحریک سے زیادہ منظّم تھی۔'' (ترقی پسند ادب، سردار جعفری، ص: ۱۹۳-۱۹۴)

5.6 نمونہ امتحانی سوالات

۱۔ حلقۂ ارباب ذوق کے بارے میں لکھیے؟

۲۔ حلقۂ ارباب ذوق کے فکری تصورات کے بارے میں لکھیے؟

۳۔ حلقۂ ارباب ذوق کے شعری تصورات کے متعلق لکھیے؟

۴۔ حلقہ ارباب ذوق کے روحِ رواں میراجی کی نظم نگاری کے بارے میں لکھیے؟

۵۔ ن م راشد کی نظم نگاری کے بارے میں لکھیے؟

5.7 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
اقدار	قدریں، رسوم و رواج	ترویج	رواج دینا
ترفع	بلندی	راغب ہونا	خواہشمند ہونا
عزائم	حوصلہ	پیش قدمی	پہل کرنا
سخن طراز	شاعر، سخن آرا	متوازی	ساتھ ساتھ چلنے والا
افتراق	دوری، فرق	انحطاط	زوال، کمی
پژمردگی	مایوسی	متضاد	اُلٹا، مخالف
استحکام	مضبوطی، پختگی	موردِ الزام	ملزم ٹھہرانا
ہم آہنگی	ربط، مطابقت	تحرک	حرکت، ہلنے کا عمل

5.8 سفارش کردہ کتابیں

1.	یونس جاوید	حلقۂ ارباب ذوق
2.	شعر و حکمت	ن م راشد نمبر
3.	نئ تحریریں	حلقہ کی ایک روایت از الطاف گوہر
4.	انور سدید	اردو ادب کی تحریکیں
5.	علی سردار جعفری	ترقی پسند ادب
6.	عقیل احمد صدیقی	جدید اردو نظم نظریہ اور عمل
7.	وزیر آغا	نظم جدید کی کروٹیں
8.	دیباچہ مرغوب علی	میراجی کی نظمیں
9.	ن م راشد	ماورا
10.	ن م راشد	لا = انسان
11.	خاور جمیل	ادب کلچر اور مسائل
12.	جدید شاعری	عبادت بریلوی

اکائی 6: اردو نظم اور انجمن پنجاب

ساخت

6.1 اغراض و مقاصد
6.2 تمہید
6.3 نظمِ جدید کی تحریک
6.4 انجمن پنجاب کا تعارف
6.5 اہم خصوصیات
6.6 خلاصہ
6.7 اپنی معلومات کی جانچ
6.8 نمونہ امتحانی سوالات
6.9 فرہنگ
6.10 سفارش کردہ کتابیں

6.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں اردو نظم میں انجمن پنجاب کی ادبی خدمات کو اس کے اصل سیاق میں دیکھنے اور اس کی خصوصیات بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

اردو نظم اور انجمن پنجاب کے کردار پر اظہارِ خیال کر سکیں۔

اردو نظم میں جدید رویوں کی شناخت کر سکیں۔

اردو نظم کے جدید عناصر کی خصوصیات بیان کر سکیں۔

6.2 تمہید

آپ یہ جان چکے ہیں کہ اردو نظم میں وطنیت کے تصور کا پس منظر کیا ہے؟ آپ اس کی خصوصیات سے بھی واقف ہو چکے ہیں۔ آپ کو علم ہو چکا ہے کہ اردو نظم میں وطنیت کن عناصر سے مربوط ہے؟ ان عناصر کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ کسی رجحان کے فروغ میں سیاسی حالات بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ ایک مخصوص شعری رویہ کئی بڑے طبقوں کو متاثر کر سکتا ہے اور انھیں فکری اور عملی طور پر ایک کڑی میں پرو سکتا ہے۔ ہر بڑی تحریک کے لیے ایک بڑی تنظیم کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً مسلم یونیورسٹی کے ذریعے سرسید کی علی گڑھ تحریک پروان چڑھی۔ جدید اردو نظم کے فروغ میں انجمن پنجاب کا کردار تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ اس اکائی میں انجمن پنجاب کا مطالعہ مقصود ہے۔

6.3 نظمِ جدید کی تحریک:

زمین مشرق پر اہل مغرب کے فلسفہ حیات کی آبیاری ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان میں قدم جماتے ہی شروع ہو چکی تھی۔ اس انقلاب کا نقطہ عروج ۱۸۵۷ء کا وہ سانحہ ہے جس نے شکست خوردہ اہل ہند کو انفرادی و اجتماعی، ذہنی و عملی رویوں پر نظر ثانی کی طرف راغب کیا۔ مغربی تہذیب و تمدن کے اثر سے نیچر، سائنس، ارضیت اور افادیت جیسی قدروں کو بنیادی حیثیت حاصل ہونے لگی سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء نے ان اقدار کے معاشرے میں رواج دینے کو نجات اور ترقی کا وسیلہ قرار دیا۔ اس ہمہ گیر اصلاحی عمل اور سرسید اور اس کے رفقاء کی اجتماعی کوششوں نے 'تحریک علی گڑھ' کا نام حاصل کیا۔ زندگی کی روایتی قدروں سے ہمہ گیر عقیدت کے حامل لوگوں کی طرف سے اس کا پر جوش ردعمل دیکھنے میں آیا لیکن یہ انقلاب سیلاب کی طرح راستے کی تمام رکاوٹوں کو بہالے گیا۔ شعر و ادب پر بھی اس کا اثر ہوا۔ کہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے مسائل ہی شاعری کا خام مواد ہیں چنانچہ زندگی کی مادی ضرورتوں اور اجتماعی مسائل کو براہ راست شاعری میں پیش کرنے کے لیے نظم کو موزوں صنف سخن سمجھا گیا کہ خود یورپ میں اس صنف کا خوب چرچا تھا۔ جدید نظم کے علم برداروں میں محمد حسین آزاد کا نام سرفہرست ہے۔ انہیں اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ نئی تہذیب اور نئے علوم و فنون کے اثرات سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں، بدلتے ہوئے حالات نے نظم کا نیا تصور قائم کرنے میں مدد دی۔ کرنل ہالرائڈ اس وقت پنجاب کے سررشتہ تعلیم کے منتظم اعلی تھے۔ ان کے مشورے اور لاہور کے ہندو مسلم اور سکھ علماء و فضلا کی مدد سے ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو محمد حسین آزاد نے 'انجمن پنجاب' قائم کیا تا کہ اپنے مقصد میں کامیابی کے لیے انہیں ایک پلیٹ فارم مل سکے۔ انجمن پنجاب کا قیام ایک تاریخی قدم تھا۔ کرنل ہالرائڈ اس انجمن کے سرپرست تھے۔ اور انہیں کی صدارت میں ۱۸۶۷ء میں پہلی بار جلسہ ہوا جس میں مولانا محمد حسین آزاد نے 'نظم اور کلام موزوں' کے باب میں کافی اہم لکچر دیا۔ اس کے بعد یہاں ماہانہ لکچر ہونے لگے۔ آزاد نے قدیم شاعری کی خامیاں اور جدید نظمیہ شاعری کے محاسن کی طرف لوگوں کی توجہ دلائی۔ آزاد کے انہیں لکچرز نے لوگوں کے ذہنوں کو جدید نظم کی طرف مائل کیا۔ ۷۵-۱۸۷۴ء کے جلسے میں ایک اہم بات یہ ہوئی کہ مصرعہ طرح پر غزلیں پڑھنے کے بجائے مختلف موضوعات پر نظمیں پڑھی گئیں۔

6.4 انجمن پنجاب کا تعارف

21 جنوری 1865 کو سکشا سبھا کے مکان میں انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت حکومت کے کچھ عہدیدار، حکومت کے مداح اور انگریزی ذہنیت کے بعض افراد اس میں شریک ہوئے تھے۔ اس کے پہلے صدر پنڈت من پھول ہوئے۔ اس اولین جلسے میں انھوں نے جو تقریر کی اس کا لب لباب یہ ہے کہ کلکتہ اور لکھنو کی طرح لاہور میں بھی ایک انجمن قائم کی جائے جس کے ذریعے علم و ہنر کی ترقی اور مطالب مفیدہ پر مبنی لٹریچر شائع کیا جاسکے۔ اس وقت ڈاکٹر جی۔ ڈبلیوں۔ لائٹنر گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کی حیثیت سے لاہور آئے تھے۔ پنڈت من پھول کی تجویز پر انھیں انجمن کا صدر، منشی ہرسکھ رائے کو شعبہ فارسی کا سکریٹری اور بابو نوین چندرائے کو شعبہ انگریزی کا سکریٹری منتخب کیا گیا انجمن کا قیام چونکہ حکومت کے اشارے پر ہی کیا گیا تھا، اس لیے اس وقت 34 حضرات اس کے ممبر بن گئے جن میں ہندو مسلمان، رؤساء، حکام اور چند طلبہ شامل تھے۔ پنڈت من پھول نے اس کا نام انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب (Society for the diffusion of useful knowledge in the Punjab) رکھنے کی تجویز پیش کی جو منظور کر لی گئی۔ بنیادی طور پر یہ تعلیمی، ادبی اور فلاحی انجمن تھی۔ اس انجمن کے مقاصد میں قدیم مشرقی علوم کا احیاء ملک کے باشندوں میں دیسی زبان کے ذریعے علوم مفیدہ کی اشاعت،

ملک کے متعدد خطوں کے درمیان بہتر تعلقات استوار کرنا، ملک کی عام ترقی اور شہری نظم و نسق کی درستی کے لیے تیار رہنا، حاکم و محکوم میں رابطے کو مستحکم بنانا، حکومت کو رائے عامہ سے آگاہ کرنا اور مختلف ملکی مسائل پر تبادلہ خیال کرنا شامل ہے۔

ان مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے کچھ منصوبے بنائے گئے مثلاً مدارس و مکاتب، لائبریری اور ریڈنگ روم قائم کیے جائیں۔ ایک رسالہ جاری کیا جائے۔ لٹریچر تیار ہو۔ علمی جلسے منعقد ہوں جن میں مختلف تعلیمی، سماجی، تہذیبی، اخلاقی، اصلاحی اور انتظامی مسائل پر مضامین پڑھے جائیں۔ اظہار خیال کا موقع دیا جائے۔ لکچروں کا اہتمام کیا جائے۔ رفتہ رفتہ انجمن کے جلسوں میں اراکین کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ ایک سال میں یہ تعداد 244 ہوگئی۔ 27 مارچ 1867 میں ڈاکٹر لائٹنر کی خواہش پر محمد حسین آزاد کو انجمن کا سکریٹری بنا دیا گیا۔ آزاد نے عہدہ سنبھالتے ہی سرگرمیوں میں کافی اضافہ کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں نئی روح پھونک دی۔ ایک ہی برس میں مختلف موضوعات پر 36 مضامین، لیکچر اور تبصرے پڑھے۔ اس میں ان کا مشہور لیکچر، خیالات در بابِ نظم اور کلامِ موزوں، بھی ہے جو بعد میں ''نظم آزاد'' کے مقدمے کے بطور شائع ہوا، اور جسے جدید نظم نگاری کی تاریخ میں منشور کی حیثیت حاصل ہوئی۔ آزاد انجمن کے ترجمان 'رسالہ انجمن اشاعت مفیدہ' کے مدیر بھی رہے۔

انجمن نے دیگر زبانوں کے ساتھ اردو ادب کی بے بہا خدمات انجام دیں۔ مغربی علوم و فنون سے استفادے نے اردو شعر و ادب میں نئی جہتوں کے لیے راہ ہموار کی۔ یہی پس منظر ہے جس میں اردو میں نظم نگاری اور موضوعاتی مشاعروں کو تحریک ملی۔ کرنل ہالرائڈ اور محمد حسین آزاد کی کوششوں نے اردو شاعری کو ایک نیا موڑ دیا۔ یہ ایسا انقلابی قدم تھا جو انجمن کے تیار کردہ ماحول کے بغیر ممکن نہ تھا۔ محمد حسین آزاد نے اپنے لکچر 'خیالات در باب نظم اور کلام موزوں' میں انگریزی علوم و فنون اور ادبیات کی جانب مائل کیا اور نیچرل شاعری کی وکالت کی۔ نظم کے لیے نظری اساس قائم کی اور عملاً چند نظمیں مثنوی کے بطور لکھیں۔ اس کے بعد انگریزی نظموں کے خیالات کو اردو جامہ پہنانے کا سلسلہ چل نکلا۔ محمد حسین آزاد، حالی، اسماعیل میرٹھی، سرور جہان آبادی سے لے کر اکبر الہ آبادی تک یہ روایت مستحکم ہوگئی۔ کرنل ہالرائڈ کے یہ مشورے اور محمد حسین آزاد کی معاونت سے انجمن نے ماہانہ مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا جس میں مصرع طرح کے بجائے کوئی موضوع دیا جاتا تھا پنڈت دتا تریا کیفی نے ان مشاعروں کو مشاعرہ کے بجائے مناظمہ کہا ہے۔ 19 اپریل 1874 کے جلسے میں آزاد نے نظم 'شب قدر' سنائی۔ ہالرائڈ نے اس جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس جلسے کا مقصد اردو نظم کو بد حالی سے نکال کر وسعتوں سے ہم کنار کرنا ہے۔ اس کے بعد مشاعرے منعقد ہوتے رہے اور جدید شاعری پر مباحث کو ایک نیا سلسلہ میسر آیا۔ اردو نظم کے فروغ میں انجمن کا براہ راست کوئی کردار نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان مشاعروں کا انجمن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ مشاعرے محکمہ تعلیم منعقد کراتا تھا۔ انجمن سے تعلق صرف اس قدر تھا کہ یہ انجمن کے مکان میں منعقد ہوا کرتے تھے اور ان کی روداد انجمن کے رسالے میں شائع ہوتی تھی۔ صرف اس بنیاد پر انھیں انجمن کا مشاعرہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو نظم کے فروغ میں انجمن کے تیار کردہ ماحول نے نہ صرف پس منظر کا کام دیا بلکہ اسے تحریک تک پہنچانے میں بھی اس کے محرکات اور اثرات کا دخل ہے۔ یہاں سے اردو نظم کو ایک سمت حاصل ہوئی۔ اس نے وہ رفتار پکڑی کہ پابند نظموں سے، معرا، اور آج معرا سے آزاد اور نثری نظموں کی مضبوط روایت قائم ہو چکی ہے۔

انجمن پنجاب کے سیاق میں اردو نظم کی پوری تحریک نوآبادیاتی جبر کا منظر نامہ ہے جس میں مشرقی روایات کو فرسودہ قرار دے کر مغربی روایتوں کو اردو میں داخل کرنے کی شعوری کوششیں کرائی گئیں لیکن کوئی بھی تحریک اپنی زمین میں پھلتی پھولتی ہے۔ خلا میں اس کا جنم نہیں ہوتا۔ نظم نگاری کی تحریک کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کی ابتدا جیسے اور جن مقاصد کے تحت بھی ہوئی ہو، لیکن اس

نے بال و پر اپنی آب و ہوا میں نکالے۔ سرسید تحریک نے اسے فروغ دیا۔

6.5 اہم خصوصیات

انجمن پنجاب کا قیام بنیادی طور پر حکومت اور عوام کے رابطوں میں استواری پیدا کرنے کے منصوبے کے تحت عمل میں آیا تھا۔ یہ تعلیمی، ادبی اور فلاحی انجمن تھی جس کا ایک مقصد قدیم مشرقی علوم کا احیا کرنا تھا۔ ملک کے باشندوں میں دیسی زبان کے ذریعے علوم مفیدہ کی اشاعت اس کے اہم منصوبوں میں تھا۔ انگریز حکام کی خواہش کے مطابق ملک کے متعدد خطوں کے درمیان بہتر تعلقات استوار کرنا اور ملک کی عام ترقی اور شہری نظم ونسق کی درستی کی طرف توجہ انجمن کے فکری ڈھانچے کی بنیاد ہے۔ حکومت کو رائے عامہ سے آگاہ کرنا اور مختلف ملکی مسائل پر تبادلہ خیال کرنا انجمن کے مقاصد میں شامل ہے۔ کرنل ہالرائڈ اور محمد حسین آزاد کے ذریعے انجمن کی عمارت میں نظم نگاری کی تحریک پروان چڑھی جو نظم اردو کی تاریخ میں سنگ میل ثابت ہوئی۔

6.6 خلاصہ

انجمن پنجاب کا قیام 21 جنوری 1865 کو سکشا سبھا کے مکان میں عمل میں آیا۔

انجمن کے پہلے صدر پنڈت من پھول تھے۔

ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو۔ لائٹر گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔

پنڈت من پھول نے انجمن کا نام انجمن اشاعت مطالب مفید و پنجاب رکھا۔

27 مارچ 1867 میں ڈاکٹر لائٹر کی خواہش پر محمد حسین آزاد کو انجمن کا سکریٹری بنایا گیا تھا۔

خیالات در باب نظم اور کلام موزوں، محمد حسین آزاد کا مشہور لیکچر ہے جو بعد میں نظم آزاد کے مقدمے کے بطور شائع ہوا، اور جسے جدید نظم نگاری کی تاریخ میں منشور کی حیثیت حاصل ہوئی۔

6.7 اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات

(ا) انجمن پنجاب، لاہور کا قیام عمل میں آیا؟

(الف) 1865

(ب) 1845

(ج) 1889

(۲) کس کے مشورے پر محمد حسین آزاد کو انجمن پنجاب کا سکریٹری بنایا گیا؟

(الف) ولیم نکلسن

(ب) کرنل ہالرائڈ

(ج) ڈاکٹر لائٹر

(۳) انجمن اشاعت مطالب مفیدہ کیا ہے؟

(الف) چھاپا خانہ

(ب) علمی، ادبی اور فلاحی انجمن

(ج) لائبریری

(۴) محمد حسین آزاد کی کوششوں سے شروع ہوا؟

(الف) موضوعاتی نظم نگاری کا سلسلہ

(ب) طرحی مشاعروں کا سلسلہ

(ج) تقریری مقابلوں کا سلسلہ

6.8 نمونہ امتحانی سوالات

(۱) مندرجہ ذیل میں سے ہر سوال کا جواب تقریباً تیس سطروں میں لکھیے۔

(الف) اردو نظم میں انجمن پنجاب کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

(ب) نیچرل شاعری کے محرکات کیا ہیں؟

(ج) نظم نگاری کی تحریک میں محمد حسین آزاد کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

(۲) کسی ایک پر نوٹ لکھیے۔

(الف) محمد حسین آزاد

(ب) حالی

(ج) کرنل ہالرائڈ

6.9 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
خلاقانہ	بنایا ہوا	تشہیر	مشہور کرنا، شہرت دینا
امتزاج	ملاوٹ، آمیزش	معتدل	اعتدال ہونا، توازن ہونا
ارتفاع	اونچان، بلندی	عمق	گہرائی
اتباع	پیروی، تقلید کرنا	ایمائیت	اشارہ کرنا
مافی الضمیر	اپنے بارے میں بتانا	بے مائیگی	بے مدد
قنوطیت	مایوسی، ناامیدی	التفات	متوجہ ہونا، رغبت
ابعاد	دوریاں، فاصلے	مماثل	نظیر، برابر
الیاتی	چھوٹا	علامیہ	عکامت
مدغم	پیوست کیا گیا	میراث	مال وراثت

6.10 سفارش کردہ کتابیں

(۱)اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ مصنف: منظر اعظمی

(۲)جدید ہندوستان کے معمار: سید احمد خاں مصنف: خلیق احمد نظامی

(۳)اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر مصنف: ڈاکٹر عبدالعلیم

(۴)جدید اردو نظم اور یوروپین اثرات مصنف: ڈاکٹر حامدی کاشمیری

(۵)علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں مرتب: سید الطاف بریلوی

(۶)اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم مصنف: حنیف کیفی

بلاک ۔۳:

بلاک ۔۳ بھی تین اکائیوں پر مشتمل ہے۔اس بلاک میں ساتویں اکائی سے لےکر نویں اکائی تک کا مواد شامل ہے۔ساتویں اکائی 'نظیر اکبرآبادی اور ان کی نظم آدمی نامہ' کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔نظیر نے زندگی کے گونا گوں مسائل مثلاً مذہب،عشق،موسم،تیوہار،کھیل کود،تفریحات،موت،زیست،نیرنگی زمانہ،بچپن،جوانی،بڑھاپا،مفلسی،سماجی ناانصافی وغیرہ پر نظمیں لکھیں۔

آٹھویں اکائی 'خواجہ الطاف حسین حالی اور ان کے مسدس' پر ہے۔حالؔی نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی لیکن جدید اردو نظم کو پروان چڑھانے اور اسے فروغ دینے میں انھوں نے اپنا خون جگر صرف کیا اور اسی لیے اردو نظم نگاری کی تاریخ میں انھیں امتیازی مقام حاصل ہے۔

نویں اکائی 'اکبرالہ آبادی کی اور ان کی نظم مستقبل' پر ہے۔اکبؔرالہ آبادی کو اردو نظم کی نشو نما اور فروغ میں منفرد مقام حاصل ہے۔اکبؔر نے اردو نظم نگاری میں ایک نئے طرز یعنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی بنیاد رکھی۔انھوں نے طنزومزاح کو سماج اور معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔

اکائی:7 نظیر اکبرآبادی۔۔۔آدمی نامہ

ساخت

7.1 اغراض ومقاصد

7.2 تمہید

7.3 نظیر اکبرآبادی کا تعارف

7.3.1 حالات زندگی

7.3.2 شاعری کی خصوصیات

7.4 نظیر اکبرآبادی کی نظم 'آدمی نامہ'

7.4.1 متن

7.4.2 تشریح

7.4.3 تجزیہ

7.5 خلاصہ

7.6 نمونۂ امتحانی سوالات

7.7 فرہنگ

7.8 سفارش کردہ کتابیں

7.1: اغراض ومقاصد

اس اکائی میں نظیر اکبرآبادی کی زندگی کے حالات اوران کی شاعری خصوصاً نظم نگاری کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اوران کی نظم 'آدمی نامہ' کی تشریح اوراس کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ:

☆ نظیر اکبرآبادی کی زندگی کے حالات اورشاعرانہ خصوصیات پر اظہار خیال کرسکیں۔

☆ نظیر اکبرآبادی کی نظم 'آدمی نامہ' کی تشریح کرسکیں۔

☆ نظم 'آدمی نامہ' کا تجزیہ اورخلاصہ بیان کرسکیں۔

7.2: تمہید

اردو شاعری کی تاریخ میں نظیر اکبرآبادی کوایک منفرد مقام حاصل ہے۔انھوں نے جس دور میں (اٹھارہویں صدی کے آخراورانیسویں صدی کی ابتدا) میں شاعری کا آغاز کیا،اس عہد میں غزل،قصیدہ،مثنوی اور مرثیہ لکھنے پر زیادہ زورتھااورنظم

نگاری پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔اس اعتبار سے نظیر اکبرآبادی اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مروّجہ روایات کے برعکس نظم نگاری کوغزل گوئی پر ترجیح دی اور نظموں کو ہی اپنے جذبات واحساسات کی ترجمانی کا ذریعہ بنایا۔یہی وجہ ہے کہ اردو نظم نگاری میں نظیر اکبرآبادی کوسنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔انھوں نے زندگی کے گوناگوں مسائل مثلاً مذہب، عشق، موسم، تیوہار، کھیل کود، تفریحات، موت، زیست، نیرنگی زمانہ، بچپن، جوانی، بڑھاپا، مفلسی، سماجی ناانصافی وغیرہ پر نظمیں لکھیں۔انھوں نے عام انسانی زندگی کے حالات ومسائل کو اپنی نظموں میں پیش کیا اور ایک عوامی شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ان کی نظموں میں سماج اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔صداقت، انسان دوستی اور مشترکہ تہذیب وتمدّن کے وہ امین ہیں۔نظیر اکبرآبادی کا تجربہ ومشاہدہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔

7.3: نظیر اکبرآبادی کا تعارف

7.3.1: حالات زندگی

نام ولی محمد اور نظیرؔ تخلص تھا۔اردو شاعری میں نظیر اکبرآبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔نظیرؔ کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں اختلاف رائے ہے۔تاہم عام طور پر یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ وہ 1740ء کے آس پاس دہلی میں پیدا ہوئے اور 1830ء میں ان کی وفات آگرہ میں ہوئی۔انھوں نے کم وبیش 90 سال کی عمر پائی۔نظیرؔ کے والد کا نام محمد فاروق تھا اور ان کی والدہ آگرے کے قلع دار نواب سلطان خاں کی لڑکی تھیں۔وہ اپنے والدین کے اکلوتے لڑکے تھے لہٰذا انھیں بہت لاڈ پیار ملتا تھا۔بچپن سے ہی نظیرؔ کو کھیل کود اور تفریحات سے خاص شغف تھا۔وہ ایک بےفکر اور آزاد خیال انسان تھے۔نظیرؔ نے جس عہد میں ہوش سنبھالا وہ ایک پرآشوب دور تھا۔دلّی سیاسی انتشار کا شکار ہوکر چہار طرفہ حملے اور سازشوں سے تباہ وبرباد ہو رہی تھی۔پہلے نادر شاہ اور پھر احمد شاہ ابدالی کے دلّی پر حملے سے پریشان لوگ وہاں سے ہجرت کرکے دوسرے شہروں کی طرف کوچ کر رہے تھے۔والد کے انتقال کے بعد نظیرؔ بھی احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت اپنی ماں اور نانی کے ساتھ آگرہ (اکبرآباد) آ گئے اور ہمیشہ کے لیے یہیں سکونت اختیار کر لی۔نظیرؔ کی شادی دہلی کے فوجی سالار محمد رحمان خاں کی لڑکی سے ہوئی۔جن سے انھیں دو بچے (ایک لڑکا گلزار علی اور ایک لڑکی امامی بیگم) ہوئے۔

دلی پر ہونے والے پے درپے حملوں سے آگرہ بھی متاثر تھا اور یہاں بھی حالات ناسازگار تھے تاہم نظیرؔ نے سماجی، معاشی اور سیاسی حالات کی ستم ظریفی کے باوجود آگرے کو ہی اپنا وطن بنالیا۔اس شہر سے انھیں بے پناہ محبت اور الفت تھی۔خود کہتے ہیں:

عاشق کہو، اسیر کہو آگرے کا ہے
ملا کہو، دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو، فقیر کہو آگرے کا ہے
شاعر کہو ، نظیرؔ کہو آگرے کا ہے

یہ وہی آگرہ شہر ہے جو کبھی مغل بادشاہ اکبر کا دارالخلافہ تھا اور آج بھی یہ شہر مغل بادشاہ شاہ جہاں کی بے مثال تعبیر ''تاج محل'' کے لیے مشہور ہے جہاں دنیا کے ہر خطے کے لوگ اس عظیم عمارت کا دیدار کرنے آتے ہیں۔

نظیرؔ نے اردو کے علاوہ عربی اور فارسی کی بنیادی تعلیم حاصل کی تھی۔تلوار بازی، حکمت، فن خطاطی میں بھی ان کی دلچسپی

تھی۔ وہ مزاجاً آزاد خیال انسان تھے۔ ظرافت اور شوخی بھی ان کی فطرت کی حصّہ تھی۔ وہ تنہائی پسند نہیں بلکہ مجلس میں رہنے والے شخص تھے۔ لہٰذا زندگی کے نشیب و فراز کا انھوں نے عمیق مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ کیا۔ ہندوستانی تہذیب و ثقافت، مشترکہ تہذیب و تمدّن، انسان دوستی، صداقت، تہواروں اور کھیل کود وغیرہ سے انھیں خاص دلچسپی تھی جس کا ذکر ان کی نظموں میں جا بجا موجود ہے۔

وہ منکسر المزاج شخص تھے۔ سماج کے ہر طبقے کے لوگوں سے ان کا ربط ضبط تھا۔ ہر مذہب و ملّت کے ماننے والے انھیں عزیز رکھتے تھے۔ وہ ہر مذہبی موقعے پر ان کے ساتھ شریک بھی ہوتے تھے۔ وہ پوری زندگی معلّمی کے پیشے سے منسلک رہے لہٰذا ایک معلم کی معاشی پریشانیوں سے بھی وہ بخوبی واقف تھے۔ نظم 'مفلسی' میں انھوں نے معلم کی معاشی صورتحال کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

وہ جو غریب غربا کے بچے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

نظیر اکبرآبادی نے ایک عوامی شاعر کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کی۔ انسان کی روزمرّہ زندگی، سماج اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں کی اپنی نظموں میں حقیقت پسندانہ عکاسی کی وجہ سے انھوں نے عوام کے دلوں پر حکمرانی کی اور آج بھی ان کی نظمیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

۱۔ نظیر اکبرآبادی کہاں پیدا ہوئے؟
۲۔ نظیر کے والد کا نام کیا تھا؟
۳۔ نظیر کس پیشے سے منسلک تھے؟
۴۔ نظیر کا انتقال کس شہر میں ہوا؟
۵۔ نظیر کا اصل نام کیا تھا؟

7.3.2: شاعری کی خصوصیات

نظیر اکبرآبادی بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں۔ انھوں نے غزل اور دیگر اصنافِ سخن پر بھی طبع آزمائی کی لیکن انھیں شہرت نظموں کی وجہ سے ہی ملی۔ میرؔ، سوداؔ، میر حسنؔ، جرأتؔ وغیرہ جیسے بلند پایہ شاعر ان کے ہم عصر تھے۔ یہ دور اردو غزل کا عہدِ زریں تھا۔ لیکن نظیرؔ نے نظم نگاری کو اپنی شاعری کے لیے منتخب کیا اور اپنے مخصوص اسلوب اور عوامی لب و لہجے سے اردو نظم کو ایک نئی راہ دکھائی۔ انھوں نے اردو شاعری کو خیالی دنیا سے باہر نکال کر انسان کی حقیقی زندگی سے اس کا رشتہ جوڑا۔

شعر و ادب کی تخلیق کے محرکات انسانی زندگی اور سماج و معاشرے میں رونما ہونے والے مختلف حالات و واقعات ہوتے ہیں اور ادیب یا شاعر اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اسے اپنی تخلیقات کا حصّہ بناتا ہے۔ اس لحاظ سے نظیر اکبرآبادی ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے لیے سارا مواد اپنے گرد و پیش کے سماج اور معاشرے سے اخذ کیا اور انھیں پوری سنجیدگی اور دردمندی کے ساتھ اپنی نظموں میں پیش کیا۔ نظیر اکبرآبادی نے اپنے عہد میں مروّجہ شعری روایات کے برعکس عوامی معاملات و مسائل کو اپنے تخیل، تجربے، مشاہدے اور انسان دوستی کے جذبے سے معمور ہو کر اپنی شاعری میں جگہ

دی۔ بقول مجنوں گورکھپوری:

''نظیر کا کلام اپنے وقت اور اپنے ماحول کا آئینہ ہے۔ واقعات و حالات اور رسوم و روایات کی جیسی زندگی سے معمور تصویریں نظیر نے ہم کو دی ہیں وہ اردو شاعری کے حصّے کی چیز نہ تھیں۔''

انسانی زندگی اور معاشرے کی حقیقتوں اور حالات و مسائل کو نظیر نے اپنے تجربے و مشاہدے اور تخیل کی بلند پروازی سے اپنی نظموں میں فنکارانہ مہارت سے پیش کیا ہے۔ وہ اپنی تخلیقی صلاحیت، زورِ بیان اور قادرالکلامی کے ذریعے اپنے جذبات واحساسات اور مشاہدات کی ترجمانی اتنے خوبصورت پیرائے میں کرتے ہیں کہ قاری کے سامنے اس کی پوری تصویر گھوم جاتی ہے۔ سادگی اور برجستگی ان کے کلام کو پُر اثر بناتی ہے۔ ہولی، دیوالی، آگرہ کی تیراکی، مفلسی، تندرستی، برسات کی بہاریں، آندھی، بھونچال، ریچھ کا بچہ، چاندنی رات وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو مرقع نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔

نظیر کا تجربہ و مشاہدہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی بھی پہلو خواہ اس کا تعلق مذہب، سیاست، سماج، معیشت، تہذیب و تمدن، کھیل کود، سیر و تفریح وغیرہ کسی سے بھی ہو، ان کی نظروں سے اوجھل نہیں رہتا۔ وہ انسانی زندگی کے ہر گوشے اور پہلو کو فنی چابکدستی اور ہنرمندی سے موضوعِ سخن بناتے ہیں۔ بقول سید مجاور حسین:

''نظیر ہندوستان کی ادبی تاریخ کے واحد عوامی شاعر ہیں جنھوں نے دورِ حاضر کی عوامی شاعری کے لیے راہیں اور سمتیں متعین کیں اور جنھوں نے اٹھارہویں صدی میں مشترکہ کلچر، قومی یک جہتی کے تصورات اور اس کی زرعی معاشرت و تہذیب کو اپنی شاعری میں جگہ دی جو تقریباً پانچ ہزار سال کی تاریخ کی وارث تھی۔''

نظیر اکبرآبادی کا عہد اور ماحول سماجی، سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ شہر آگرہ عہد اکبر میں سماجی و سیاسی اعتبار سے ایک اہم مرکز بن چکا تھا۔ اس سرزمین پر بھگتی تحریک کی امن و آشتی، بھائی چارگی، انسان دوستی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی تعلیم چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ نظیر نے اس ماحول و معاشرے کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا اور ایک حساس شاعر کی حیثیت سے انسانی زندگی کی رنگارنگ کیفیات کو اپنے تجربے و مشاہدے سے اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے دور میں آگرہ بھی ناسازگار حالات کا شکار ہوا۔ سماجی اور معاشی اعتبار سے وہاں کے عوام کو پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس صورتحال کو نظیر نے اپنی ایک مشہور نظم ''شہر آشوب'' میں نہایت خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے۔ یہ نظم نظیر کے واضح سماجی شعور اور انسان دوستی و دردمندی کی عمدہ مثال ہے۔

نظیر کی شاعری حقائق پر مبنی ہے اور وہ زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان ہیں۔ وہ انسانیت کے پجاری ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ حرص و ہوس، مفاد پرستی اور خود غرضی انسانیت کی دشمن ہے۔ طبقاتی سماج کی کشمکش، فرسودہ روایات اور رسم و رواج کے برعکس انھوں نے انسانی زندگی میں معاشرتی حسن سلوک اور بھائی چارگی پر زور دیا۔ ان کے کلام میں مذہبی رواداری، معاشرتی حسن و سلوک اور انسان دوستی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

وہ انسان کو مذہب و ملّت یا رنگ و نسل کے نام پر نہیں بلکہ اسے صرف انسان کی حیثیت سے پہچانتے ہیں اور اس کی قدر کرتے ہیں۔ نظیر اپنے افکار و نظریات کے اعتبار سے وسیع النظر اور وسیع المشرب تھے۔ انھوں نے اپنے کلام میں اور اپنی عملی زندگی میں اعلیٰ انسانی قدروں کی پرزور حمایت کی ہے۔ سیکولر طرزِ عمل کی عمدہ مثالیں ان کی شاعری میں جابجا موجود ہیں۔ مذہب و

ملّت اور ذات پات کے تفریق سے الگ نظیر نے جس خدا کا تصور پیش کیا ہے وہ یہ ہے: ؎

جھگڑا نہ کرے مذہب و ملت کا کوئی یاں | جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں
زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآں | عاشق تو قلندر ہے نہ ہندو نہ مسلماں

کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

نظیر مذہب وملّت، ذات پات، حرص وہوس، خود غرضی، مفاد پرستی کے سبب انسانی کشمکش، محرومی اور اداسی سے خوب واقف ہیں۔ اسی لیے ان کے یہاں صبر وقناعت دردمندی، رواداری، آپسی ہم آہنگی بے ثبات زندگی کے لیے نہایت سودمند ہے۔ نظیر کے بقول:

افلاس میں، ادبار میں، اقبال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

نظیر نے زندگی کی بے ثباتی اور اس میں انسان کی محرومیوں، اداسیوں اور الجھنوں کو عوامی لب ولہجہ میں یوں پیش کیا ہے:

جو تو کہتا ہے اے غافل یہ تیرا ہے یہ میرا ہے | یہ جس کا ہے اس کا ہے نہ تیرا ہے نہ میرا ہے
تو اول سوچ دل میں کہ تو ہے کون اور کیا ہے | نمازی ہے، شرابی ہے، اچکا ہے، لٹیرا ہے
تری کیا ذات ہے، کیا نام ہے کیا کام کرتا ہے | مسافر بے وطن ہے یا تیرا اس جا پہ ڈیرا ہے
جب ان چیزوں سے تو اپنے تئیں کچھ چیز ٹھہرالے | تو اس کے بعد پھر کہیو کہ یہ تیرا ہے کہ میرا ہے
یہ چیزیں تو غرض کیا ہیں، تو اپنا ہی نہیں مالک | تجھے او بے خبر ناداں، یہ کس غفلت نے گھیرا ہے

مندرجہ بالا اشعار زندگی کے تئیں نظیر کے مثبت افکار وخیالات کا بین ثبوت ہیں۔ بے ثبات زندگی کی اہمیت اگر انسان سمجھ لے تو وہ اپنی محرومیوں اور اداسیوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے کیوں کہ بقول نظیر: ؎

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا | جب لاد چلے گا بنجارہ

نظیر اکبرآبادی کی شاعری کے موضوعات عوامی زندگی اور انسان کے حالات و واقعات سے وابستہ ہیں، اس لیے انھوں نے عوامی زبان اور عام لب ولہجہ کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ ان کی زبان عام فہم اور سادہ ہے۔ بنجارہ نامہ، آدمی نامہ، مفلسی، روٹیاں، تندرستی، عاشق نامہ، چڑیوں کی تسبیح، طفلی نامہ، کلجگ، عید، دیوالی، ہولی، شب برات، جنم کنہیا جی، تاج گنج کا روضہ، عشق اللہ، حضرت سلیم چشتی، حضرت گرو گنج بخش، کورا برتن، روٹی نامہ، ریچھ کا بچہ، جوگن نامہ، راکھی، بلدیو جی کا میلہ، برسات کی بہاریں، جھونپڑا، آٹے دال کا بیان وغیرہ جیسی نظمیں عوامی مسائل سے نظیر اکبرآبادی کی دلچسپی کو نمایاں کرتی ہیں۔ ان کی شاعری زندگی کے بنیادی حقائق کی نہ صرف نشاندہی کرتی ہے بلکہ تمام جزئیات کے ساتھ ان کی حقیقی عکاسی بھی ہے۔ ان کے کلام میں زندگی اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ نظیر اکبرآبادی اپنے شاعرانہ کمالات کی بدولت بلاشبہ اردو نظم نگاری کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

۱۔ نظیر کے دو معاصر شعرا کے نام لکھیے۔

۲۔نظیرؔ کی چار نظموں کے عنوان لکھیے۔
۳۔نظیرؔ کی شاعری کے موضوعات کیا ہیں؟

7.4: نظیرؔ اکبرآبادی کی نظم 'آدمی نامہ'

7.4.1: متن

آدمی نامہ

دُنیا میں بادشہ ہے، سو ہے وہ بھی آدمی　　اور مُفلس و گدا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
زر دار و بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی　　نعمت جو کھا رہا ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور　　یاں آدمی ہی پاس ہے، اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حُسن و قبح میں ہے یاں ظہور　　شیطاں بھی آدمی ہے، جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی، رہنما ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں ، میاں!　　بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن ، اور نماز ، یاں　　اور آدمی ہی، اُن کی چُراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی　　اور آدمی ہی تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اُتارے ہے آدمی　　چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سُن کے دوڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دُکانیں لگا لگا　　کہتا ہے کوئی ، لو ! کوئی کہتا ہے، لارے لا!
اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا　　کس کس طرح سے بیچیں ہیں چیزیں؟ بنا بنا
اور مول لے رہا ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی

اِک آدمی ہیں، جن کی یہ کچھ زرق برق ہے　　روپے کے جن کے پاؤں ہیں، سونے کے فرق ہیں
جُھمکے ، تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں　　کمخواب ، تاش ، شال ، دو شالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر　　ہیں آدمی ہی صاحبِ عزت اور حقیر
یاں آدمی مُرید ہیں اور آدمی ہی پیر　　اچّھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیرؔ!
اور سب میں جو بُرا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

7.4.2: تشریح

نظیرؔ اکبرآبادی کی نظم ''آدمی نامہ'' پانچ مصرعوں کی مخمس ترکیب بند ہے۔اس نظم میں شاعر نے سماج اور معاشرے میں

انسان کے مختلف مراتب اور پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔

پہلے بند میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں چاہے بادشاہ ہو یا مفلس، دولت مند ہو یا فقیر، وہ آدمی جسے آرام کے ساتھ کھانا میسر ہے اور وہ آدمی جو بھیک مانگ کر اپنی زندگی بسر کر رہا ہے، سب انسان ہیں۔

دوسرے بند میں شاعر کہتا ہے کہ انسان ایک دوسرے کے لیے آگ کی طرح مصیبت اور پریشانی کا سبب بھی ہے تو وہی محبت کی طرح راحت اور روشنی کا ذریعہ بھی۔ اسی دنیا میں ہی آدمی کی تمام خوبصورتی اور بدصورتی، اچھائی اور برائی اجاگر ہوتی ہے اور آدمی ہی کو شیطانی حرکات میں مہارت حاصل ہے یعنی وہ مکر وفریب سے کام لیتا ہے، تو دوسری طرف وہی صحیح راستہ دکھانے کا کام بھی کرتا ہے۔

تیسرے بند میں اس بات کی طرف توجہ مرکوز کی گئی ہے کہ دنیا میں اللہ کی عبادت کے لیے مسجد بھی انسان ہی بناتے ہیں اور وہی نماز پڑھتے اور پڑھاتے ہیں اور اللہ کے احکام کا ذکر اپنے خطبے میں کرتے ہیں۔ آدمی ہی قرآن اور نماز پڑھتے ہیں اور وہ بھی آدم ہی کی اولاد ہیں جو مسجدوں سے جوتے چپل چراتے ہیں اور وہ بھی آدمی ہی ہے جو ان کی حرکتوں کو بھانپ لیتا ہے۔

چوتھے بند میں یہ کہا جا رہا ہے کہ دنیا میں آدمی ہی آدمی کی حفاظت کے لیے اپنی جان کی پروا نہیں کرتا اور یہی انسان دوسرے انسان کا دشمن بن کر اس کا سر تلوار سے کاٹ دیتا ہے۔ یہاں انسان ہی انسان کی بے عزتی اور بے حرمتی کرتا ہے۔ مصیبت اور پریشانی میں آدمی، آدمی ہی کو آواز دیتا ہے اور اس کی آواز سُن کر اس کی مدد کے لیے آدمی ہی دوڑ کر آتا ہے۔

پانچویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں مختلف دکانیں آدمیوں نے لگا رکھی ہیں جہاں آدمی ہی سامان خریدتے ہیں۔ یہاں کوئی سامان بیچنے کے لیے محبت سے پیش آتا ہے تو کوئی بے رخی سے سامان خریدتا ہے۔ یہاں آدمی ہی سر پر ٹوکرے میں سامان اُٹھا کر اسے بیچنے کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں اور وہ مختلف قسم کی چیزیں بنا بنا کر بیچتے ہیں اور انھیں خریدنے والے بھی آدمی ہی ہوتے ہیں۔

چھٹے بند میں شاعر کہتا ہے کہ یہاں کچھ ایسے انسان ہیں جن کی شان وشوکت نرالی ہے۔ ان کے پاس دھن اور دولت کی بھرمار ہے اور عیش وآرام کی ہر چیز انھیں میسر ہے اور اس دنیا میں ایسے آدمی بھی ہیں جو پھٹے پرانے کپڑے پہن کر پریشانیوں اور مصیبتوں میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔

ساتویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں شریف، کمینے، بادشاہ، وزیر، عزّت دار لوگ، حقیر اور فقیر، مرید اور پیر سب آدم ہی کی اولاد ہیں۔ دنیا میں آدمی ہی سب سے اچھا ہے اور سب سے برا بھی آدمی ہی ہے۔ شاعر نے آخری بند کے چوتھے مصرعے میں اپنا تخلص بھی استعمال کیا ہے۔

7.4.3: تجزیہ:

'آدمی نامہ' نظیر اکبر آبادی کی ایک مشہور نظم ہے۔ نظیر اکبر آبادی انسانی زندگی کے حالات ومسائل سے سروکار رکھتے ہیں۔ ان کا کلام سماجی ومعاشرتی حالات کی حقیقی تصویر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ بقول احتشام حسین:

"نظیر پہلا شاعر ہے جو زمین پر کھڑا معلوم ہوتا ہے۔"

نظم 'آدمی نامہ' میں نظیر نے سماج اور معاشرے میں انسانی زندگی کے مختلف روپ، سماجی حیثیت اور مرتبے کو فلسفیانہ انداز میں اجاگر کیا ہے۔ وہ اس عظیم کائنات میں ہر انسان کو اہم جانتے ہیں لیکن طبقاتی سماج میں آدمی کی سماجی حیثیت اور مرتبے

کے امتیازات کو بھی بخوبی سمجھتے ہیں۔ یہ نظم انسان کی سماجی حیثیت اور اس کے مختلف روپ اور نفسیات کو اجاگر کرتی ہے جس کے ذریعے شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ دنیا میں بادشاہ ہو یا رعایا، دولت مند ہو یا فقیر، حسن اخلاق سے پیش آنے والا ہو یا مکاروفریبی، صحیح راستہ دکھانے والا ہو یا غلط راہ بتانے والا، سب آدمی کے ہی مختلف روپ ہیں۔

دنیا میں آدمی ہی مسجد بناتا ہے، وہی نماز پڑھتا ہے اور پڑھاتا ہے، خطبہ دیتا اور سنتا ہے اور آدمی ہی چوری بھی کرتا ہے۔ یہاں آدمی ہی آدمی کی خاطر اپنی جان قربان کرتا ہے اور وہی کسی آدمی کی جان بھی لیتا ہے۔ آدمی ہی آدمی کی بے عزّتی کرتا ہے اور وہی مصیبت کے وقت اس کے کام آتا ہے۔ دنیا میں شان وشوکت کے ساتھ زندگی گزارنے والا اور مفلسی میں زندگی بسر کرنے والا، شریف اور کمینہ، مالک اور غلام، بادشاہ اور وزیر، مرید اور پیر سب آدمی ہی کے مختلف روپ ہیں۔ دنیا میں جو سب سے اچھا اور سب سے بُرا ہے وہ بھی آدمی ہی ہے۔

غرض کہ اس نظم میں نظیر اکبرآبادی نے انسانی زندگی کی رنگارنگی کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ دنیا کا سارا کاروبار آدمی کے ہی دم سے چل رہا ہے اور یہاں رونق بھی آدمی ہی کی وجہ سے ہے۔ یہ نظم محض کسی ایک دور کے انسانی سماج کی تصویر کشی نہیں ہے بلکہ اس نظم کا کینوس وسیع ہے اور یہ ہر دور کے انسانی سماج کے لیے آفاقیت کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ نظم نظیر کی صداقت، رواداری اور انسان دوستی کا واضح ثبوت ہے۔ نظم 'آدمی نامہ' کے مطالعے سے نظیر اکبرآبادی کے فکروفن کی انفرادیت، تجربے اور مشاہدے کی وسعت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے فنی مہارت کے ساتھ انسانی سماج کے تضاد کو پیش کیا ہے جو قاری کو غوروفکر کرنے دعوت دیتا ہے اور سماج میں معاشرتی حسن سلوک کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ نظم اپنے عام فہم انداز بیان اور معنویت کے اعتبار سے شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔

7.5: خلاصہ

اردو شعروادب کی تاریخ میں نظیر اکبرآبادی ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی لیکن اردو نظم نگاری کو فروغ دینے اور اسے ایک اہم صنف بنانے میں ان کا کارنامہ قابل ذکر اور اہمیت کا حامل ہے۔ نظیر کا پورا نام ولی محمد اور نظیر تخلص تھا۔ اردو شاعری میں وہ نظیر اکبرآبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔ نظیر اکبرآبادی نے غزل گوئی کے مقابلے نظم نگاری کو ترجیح دی اور اس صنف کو اپنی شاعری کا ذریعہ بنایا۔ نظیر اکبرآبادی منکسر المزاج اور وسیع المشرب انسان تھے۔ عوامی مسائل، صداقت، رواداری، انسان دوستی، مشترکہ تہذیب وتمدن ان کے کلام کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ انھوں نے تشبیہات و استعارات ہندوستانی تہذیب ومعاشرے سے اخذ کیے ہیں۔

نظیر کی شاعری کے موضوعات کا تعلق عوامی حالات ومسائل سے ہے اور انھوں نے عوامی زبان اور عام لب ولہجہ کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ نظیر کی شاعری انسانی زندگی، سماج اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی ترجمان ہے۔ ان کی شاعری میں انسانی سماج اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

7.6: نمونۂ امتحانی سوالات:

۱۔ نظیر اکبرآبادی کی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ نظیر کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

۳۔ نظیر کی نظم ' آدمی نامہ ' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

7.7: فرہنگ

الفاظ	معنی
منفرد	الگ، تنہا
آغاز	شروع
مروّجہ	رائج شدہ
سنگ میل	میل کا پتھر، اہمیت کا حامل
گوناگوں	مختلف
شہرت	نام ونمود
صداقت	سچائی
مشترکہ	ملا جلا، ساجھے کا
امین	محافظ، رکھوالا
وسیع	کشادہ، پھیلا ہوا
وفات	موت، انتقال
والدین	ماں باپ
پرآشوب	بے چینی بھرا، خوف ناک، ہیبت ناک
انتشار	بے چینی
وسیع المشرب	وسیع القلب، بڑے دل والا، کھلے دل والا
ہجرت	ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا
ناسازگار	ناموافق
ستم ظریفی	بدقسمتی
دارالخلافہ	راجدھانی
فن خطاطی	خوش نویسی کا فن
ظرافت	ہنسی مذاق، مزاح
نشیب وفراز	اتار چڑھاؤ
عمیق	گہرا
مشاہدہ	کسی چیز کو غور سے دیکھنا
شغف	دلچسپی
منکسر المزاج	عاجزی اور انکسار، نرم مزاج

منسلک	جڑا ہوا
ہم عصر	ایک ہی عہد کا، ایک ہی زمانے کا
محرکات	محرک کی جمع تحریک
تخیل	سوچنا، فکر کرنا
قادرالکلامی	کلام پر قدرت رکھنے والا، اپنی باتوں کو بخوبی پیش کرنے والا
حرص وہوس	لالچ
مفاد پرست	مطلب پرست
تفریق	امتیاز، فرق
عہد زریں	سنہرا دور، بہترین زمانہ
جزئیات	جز کی جمع
مفلس وگدا	فقیر، محتاج
زردار	مالدار، دولت مند
نار	آگ
نور	روشنی
حسن وقبح	اچھا اور برا، نیک وبد
مکروزور	جعل سازی، فریب، دھوکہ
ہادی	راستہ دکھانے والا
رہنما	راہ دکھانے والا
خطبہ خواں	خطبہ دینے والا
وارنا	قربان کرنا
زرق برق	شان وشوکت
فرق	پیشانی
کم خواب	ریشمی لباس
اشراف	شرف کی جمع، شریف لوگ

7.8 سفارش کردہ کتابیں:

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ — سید احتشام حسین

نظیر نامہ — شمس الحق عثمانی

نظیر شناسی — اکبر علی بیگ، محمد علی اثر (مرتبین)

نظیر اکبر آبادی — (ہندوستانی ادب کے معمار، ساہتیہ اکادمی دہلی) محمد حسن

اکائی 8 خواجہ الطاف حسین حالؔی۔۔۔انتخاب مسدس حالی

ساخت

8.1 اغراض ومقاصد
8.2 تمہید
8.3 الطاف حسین حالؔی کا تعارف
8.3.1 حالات زندگی
8.3.2 شاعری کی خصوصیات
8.4 الطاف حسین حالؔی کی نظم انتخاب مسدّس حالی
8.4.1 متن
8.4.2 تشریح ''انتخاب مسدّس حالؔی''
8.4.3 ''انتخاب مسدّس حالی'' کا تجزیہ
8.5 خلاصہ
8.6 نمونۂ امتحانی سوالات
8.7 فرہنگ
8.8 سفارش کردہ کتابیں

8.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں خواجہ الطاف حسین حالؔی کی زندگی کے حالات اوران کے شاعرانہ کمالات بیان کیے گئے ہیں اوران کی مشہورنظم ''مسدّس حالؔی'' کے منتخب اشعار کی تشریح اوراس کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

اس اکائی کے مطالعے کے بعدطلبا سےامید کی جاتی ہے کہ:

☆ الطاف حسین حالؔی کی زندگی کے حالات اوران کی شاعری کی خصوصیات بیان کرسکیں۔
☆ حالؔی کی نظم ''مسدّس حالؔی'' پراظہارخیال کرسکیں اورانتخاب مسدس حالؔی کے اشعار کی تشریح کرسکیں۔
☆ ''انتخاب مسدّس حالؔی'' کا تجزیہ اورخلاصہ بیان کرسکیں۔

8.2 تمہید

اردوشعروادب میں خواجہ الطاف حسین حالؔی کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔حالؔی نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر، ادیب، نثر نگار، نقاداورسوانح نگار تھے بلکہ مصلح قوم بھی تھے۔حالؔی نے اردوشاعری کونئی سمت اورنئی فضا سے آشنا کیا۔اردوتنقید کا آغازان کی

کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' سے ہوا جس میں حالؔی نے شاعری اور اصول شعر سے بحث کرتے ہوئے اس کے مقاصد کو واضح کیا۔ یہ کتاب اردو شاعری اور اردو تنقید کے نئے دور کے آغاز کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

حالؔی نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی لیکن جدید اردو نظم کو پروان چڑھانے اور اسے فروغ دینے میں انھوں نے اپنا خون جگر صرف کیا اور اسی لیے اردو نظم نگاری کی تاریخ میں انھیں امتیازی مقام حاصل ہے۔ جدید اردو نثر کے فروغ میں بھی حالؔی نے ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔ حیات سعدی، یادگار غالبؔ، حیات جاوید ان کی اہم سوانحی تصانیف ہیں۔

حالؔی نے اپنے شعری سفر کا آغاز غزل گوئی سے کیا لیکن سماجی اور معاشرتی اصلاح اور قوم وملّت کی فلاح و بہبود کے لیے نظم نگاری کی طرف متوجہ ہوئے اور قومی اور نیچرل شاعر کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل کیا۔ حالؔی کی نظموں کے مطالعے سے ان کی متانت، سنجیدگی، دردمندی قوم وملّت کی بہبودی اور حب الوطنی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حالؔی کی شخصیت اردو شعر و ادب میں کئی اعتبار سے ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔

8.3 الطاف حسین حالؔی کا تعارف

8.3.1 حالات زندگی

خواجہ الطاف حسین حالؔی کے آبا و اجداد سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے اور پانی پت میں مقیم ہوئے تھے۔ حالؔی 1837ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ حالؔی کی پیدائش کے بعد ان کی والدہ دماغی مرض میں مبتلا ہو گئیں اور ابھی وہ نو برس کے ہی تھے کہ والد کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ والد کے انتقال کے بعد حالؔی بھائی بہنوں کی سرپرستی میں رہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم قرآن حفظ کرنے سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے عربی، فارسی اور دیگر مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ حالؔی کے دل میں بچپن سے ہی تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ موجود تھا لیکن گھر کی مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے وہ اسکول کی تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ اس عہد میں کم عمری میں ہی لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کا رواج عام تھا۔ حالؔی کی شادی بھی محض 17 برس کی عمر میں گھر کے لوگوں نے ان کی ماموں زاد بہن اسلام النسا کے ساتھ 1853ء میں کر دی۔ حالؔی ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ تعلیم کے حصول کے خاطر آخر کار ایک دن بغیر کسی کو بتائے رات میں دلّی کے لیے پیدل ہی نکل پڑے۔ اس وقت ان کی بیوی میکے میں تھیں اور خوش قسمتی سے ان کی سسرال کی معاشی حالت اچھی تھی۔ حالی 1854ء میں دلی پہنچے اور یہ وہ وقت تھا جب دلّی کے ادبی حلقوں میں مصطفٰی علی خاں شیفتؔہ اور غالبؔ کی شاعری کی چرچا تھا۔ حالؔی نے دلّی پہنچ کر تعلیم حاصل کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ انھیں پہلے شیفتؔہ اور پھر غالبؔ کی صحبت میں رہنے اور ان سے شعر و ادب کی باریکیوں کو سمجھنے کا موقع ملا۔ حالؔی نہایت ذہین اور بالغ النظر تھے اور ان کی یہ خوبیاں غالبؔ سے پوشیدہ نہیں تھیں اور غالبؔ نے حالؔی سے کہا تھا کہ:

''اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنے آپ پر ظلم کرو گے۔''

غالب کا یہ قول حالؔی کی ذہانت اور ذکاوت کا بین ثبوت ہے۔ دلّی کے ادبی اور علمی ماحول نے حالؔی کی شخصیت اور ان کے افکار و خیالات کی تعمیر و تشکیل میں کلیدی رول ادا کیا۔ گھر والوں کے اصرار پر حالؔی 1856ء میں واپس پانی پت چلے گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد 1857ء کا انقلاب برپا ہوا جس نے ہندوستان کے سماجی، تہذیبی، سیاسی نیز معاشی امور پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ آزادی کی ناکامی ہندوستانی عوام خصوصاً مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا سبب بنی۔

اس پر آشوب دور میں حاؔلی نے سر سید احمد خاں کے ساتھ مل کر قوم وملّت کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور نا گفتہ بہ حالات سے قوم کو نجات دلانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ قوم کی اصلاح کا کام انھوں نے شعر وادب کے ذریعہ کیا اور اپنے عہد کے حالات ومسائل کی حقیقی عکاسی اور ترجمانی کی اور عوام کو بیدار کرنے اور ترقی یافتہ قوموں سے درس لے کر زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کیا۔

1887ء میں وہ حیدر آباد گئے جہاں درس وتدریس سے جُڑے رہے۔ چار سال بعد پھر واپس پانی پت آ کر ادبی وعملی کاموں میں مشغول رہے۔ پانی پت میں ہی 31 دسمبر 1914ء کو ان کا انتقال ہوا اور اردو شعر وادب کا ایک روشن ستارہ، قوم کا غم خوار اور سچّا ہمدرد ابدی نیند سو گیا۔ لیکن آنے والی نسلوں کے لیے اپنی تخلیقات ورثے کے طور پر چھوڑ گیا جو آج بھی مشعل راہ کا کام کرتی ہیں۔ بقول سر سید احمد خاں:

''ہم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا۔ آئندہ زمانے میں جو کہا جائے گا فخر قوم، فخر شعرا، فخر علما، اور زندہ کرنے والا اور راہ بتانے والا .... کون ہے کہا جائے گا حاؔلی۔''

اپنی معلومات کی جانچ:

۱۔ حاؔلی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
۲۔ حاؔلی کے والد کا نام کیا تھا؟
۳۔ حاؔلی کی دو سوانحی تصانیف کا نام لکھیے؟
۴۔ حاؔلی نے کہاں وفات پائی؟
۵۔ حاؔلی کے آبا واجداد کہاں سے ہندوستان آئے تھے؟

8.3.2 شاعری کی خصوصیات

خواجہ الطاف حسین حاؔلی کو اردو شاعری میں بلند مرتبہ حاصل ہے۔ انھوں نے شاعری کا آغاز روایتی انداز میں غزل گوئی سے کیا۔ مثنوی اور مرثیہ بھی لکھا لیکن شاعری میں انھیں شہرت نظم نگاری کی بدولت ملی۔ اردو نظم نگاری کو فروغ دینے اور اسے ایک نئی جہت سے آشنا کرنے میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔

حاؔلی نے جس عہد میں باضابطہ شاعری کا آغاز کیا وہ سماجی اور سیاسی اعتبار سے انتشار کا زمانہ تھا۔ 1857ء کا انقلاب رونما ہو چکا تھا اور انگریزوں کے خلاف پہلی ناکام جنگ آزادی کے اثرات ہندوستانی عوام پر پڑنے لگے تھے۔ ہندوستان پر انگریزی حکومت پوری طرح قابض تھی اور وہ مسلمانوں کو خاص طور سے اس انقلاب کا ذمہ دار سمجھتی تھی اور اس لیے خصوصاً مسلمان انگریزوں کے شدید عتاب اور بربریت کا نشانہ بنے۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں کی ذہنی اور معاشرتی پستی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ مسلمان سماجی، سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی اعتبار سے ٹوٹ چکے تھے۔ وہ اپنے شاندار ماضی کی یاد میں حال اور مستقبل کے خطرات سے بے خبر تھے۔ اس نا گفتہ بہ حالات میں سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی اور سماجی اصلاح کا بار اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ سر سید کے اس اصلاحی مشن میں حاؔلی نے ان کا بھرپور ساتھ دیا اور قوم کو ذلّت اور رسوائی سے بچانے اور اسے ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بہ شانہ لانے میں شعر وادب کو ذریعہ بنایا۔ اس دور کے حالات ومسائل 'انجمن پنجاب لاہور کی نظم

گوئی کی تحریک' اور 'سرسید تحریک' نے حالؔی کو نظم نگاری کی طرف متوجہ کیا۔

حالؔی بنیادی طور پر حساس، غم خوار اور دردمند دل رکھتے تھے۔ زمانے کے تغیرات نے انھیں مزید حساس اور غم خوار بنا دیا تھا۔ مسلمانوں کا زوال اور ان کی زبوں حالی کا انھوں نے بغور مشاہدہ و مطالعہ کیا تھا۔ لہٰذا قوم و ملّت کی اصلاح کے لیے انھوں نے قومی و نیچرل شاعری پر زور دیا۔ کلام میں صداقت اور حقیقت بیانی کو اہم جانا۔ اس امر کا بین ثبوت ان کی تصنیف ''مقدمہ شعر و شاعری'' ہے جس میں انھوں نے شاعری کے اغراض و مقاصد اجاگر کیے ہیں۔ حالؔی کے نزدیک اچھا شعر وہ ہے جس میں سادگی، جوش اور اصلیت ہو یعنی وہ خیالی دنیا کے بجائے انسانی زندگی کے حقیقی مسائل کی عکاسی کرے۔ حالؔی کی شاعری کے مطالعے سے ان کے کلام کی سادگی، سلاست، روانی اور صداقت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

حالؔی نے سرسید کی فرمائش پر 1879ء میں اپنی مشہور و معروف نظم ''مدو جزر اسلام'' لکھی۔ یہ نظم مسدّس کی ہئیت میں لکھی گئی ہے اور اس لیے اسے ''مسدّس حالی'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ حالؔی نے یہ نظم ہندوستانی مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے، ان کا کھویا ہوا وقار بحال کرنے، انھیں ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بشانہ زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے اور ان کے شاندار ماضی کے کارنامے یاد دلا کر ان میں حوصلہ پیدا کرنے کی غرض سے لکھی۔ سادگی بیان، حقیقت نگاری، دردمندی اور خلوص اس نظم کی اہم خوبیاں ہیں۔ حالؔی کا یہ شاہکار مسلمانوں کو بیدار کرنے اور انھیں غور و فکر کی دعوت دینے اور عملی زندگی میں جدو جہد کرنے میں معاون ثابت ہوا۔ اس نظم کی معنویت میں اس کی آفاقیت کا راز پوشیدہ ہے۔ حالؔی نے اپنی ایک اور مشہور نظم ''مناجات بیوہ'' 1884ء میں لکھی۔ یہ نظم بیوہ عورتوں کے جذبات و احساسات اور بے کسی کی ترجمان ہے۔ معاشرے میں بیوہ عورتیں شرعی احکام کے برعکس فرسودہ رسم و رواج کے جبر کی وجہ سے لاچاری اور بے بسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

حالؔی کی نظم ''حب وطن'' ملک و قوم سے محبت، آپسی اتحاد و اتفاق اور مساوات کا درس دیتی ہے۔ قومی، اخلاقی اور اصلاحی موضوعات پر حالؔی کی نظمیں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ نظمیں عصری تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ نئے رجحانات اور امکانات کو بھی نمایاں کرتی ہیں۔ ''مسدّس حالؔی''، ''مناجات بیوہ''، ''حب وطن'' کے علاوہ ''برکھا رُت''، ''مناظرہ رحم و انصاف''، ''چُپ کی داد''، ''مٹی کا دیا'' وغیرہ جیسی ان کی نظمیں مشہور و مقبول ہوئیں۔

حالؔی شعر و ادب کی مقصدیت اور افادیت کے قائل تھے اور شعر و ادب میں یہ خوبی اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب ادیب یا شاعر خلوص، دردمندی اور صداقت کے ساتھ اپنے جذبات و خیالات اور تجربات و مشاہدات کو پیش کرے۔ بقول حالؔی:

''جو لوگ تصنیف کے درد سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ کلام میں لذّت اور مقبولیت
پیدا نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کے ایک ایک لفظ میں خون جگر کی چاشنی نہ ہو۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے حالؔی کے نظریۂ شعر و ادب اور ان کی شاعری کی خوبیوں کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ حالؔی کی نظم نگاری میں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ وطنی اور قومی تصورات بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ حالؔی نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظمیں لکھیں۔ حالؔی کی شخصیت وسیع اور ہمہ گیر افکار و خیالات کی حامل ہے اور ان کا تجزیہ و مشاہدہ عمیق ہے۔ وہ پوری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ سماجی و معاشرتی مسائل کی حقیقی عکاسی کرتے ہیں۔ سماجی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل ان کی نظموں کے اہم موضوعات ہیں۔

حالؔی کی شاعری کا سب سے بڑا جوہر سادگی، سلاست اور روانی ہے۔ ان کے کلام میں سوز و گداز، متانت، صداقت اور دردمندی جا بجا موجود ہے۔ حالؔی نے عام فہم اور سادہ تشبیہات و استعارات کا اپنے کلام میں استعمال کیا ہے اور یہی خوبیاں ان

کے کلام کے حسن کو دو بالا کرتی ہیں اور ان کی شاعری عوام کے دلوں کو چھوتی اور ان پر اثر کرتی ہے۔

حاؔلی بلاشبہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے جنھوں نے شعر و ادب کے وسیلے سے قوم اور معاشرے کی فلاح و بہبود کا کارنامہ انجام دیا۔ اپنے افکار و خیالات اور وسیع النظری سے نئے امکانات و رجحانات اور معاصر زندگی کے تقاضوں پر روشنی ڈالی۔ حاؔلی کی شاعری اپنی معنویت اور صداقت کی وجہ سے آفاقی اقدار کی حامل ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

۱۔ حاؔلی کی طویل نظم 'مدوجزر اسلام' اور کس نام سے مشہور ہے؟

۲۔ حاؔلی کے نزدیک شعر میں کیا خوبیاں ہونی چاہیے؟

۳۔ حاؔلی نے کس کی فرمائش پر 'مسدّس حاؔلی' لکھا؟

8.4 ''انتخاب مسدّس حاؔلی''

8.4.1 متن

جنھوں نے کہ تعلیم کی قدر و قیمت — نہ جانی مسلّط ہوئی اُن پہ ذلّت
ملوک اور سلاطین نے کھوئی حکومت — گھرانوں پہ چھائی امیروں کے نکبت
رہے خاندانی نہ عزت کے قابل
ہوئے سارے دعوے شرافت کے باطل

نہ چلتے ہیں واں کام کاریگروں کے — نہ برکت ہے پیشے میں پیشہ وروں کے
بگڑنے لگے کھیل سودا گروں کے — ہوئے بند دروازے اکثر گھروں کے
کماتے تھے دولت جو دن رات بیٹھے
وہ ہیں اب دھرے ہات پر ہات بیٹھے

ہنر اور فن واں ہیں سب گھٹتے جاتے — ہنر مند ہیں روز و شب گھٹتے جاتے
ادیبوں کے فضل و ادب گھٹتے جاتے — طبیب اور اُن کے مطب گھٹتے جاتے
ہوئے پست سب فلسفی اور مناظر
نہ ناظم ہیں سر سبز اُن کے نہ ناثر

اگر اک پہننے کو ٹوپی بنائیں — تو کپڑا وہ اک اور دنیا سے لائیں
جو سینے کو وہ ایک سوئی منگائیں — تو مشرق سے مغرب میں لینے کو جائیں
ہر اک شے میں غیروں کے محتاج ہیں وہ
مکنیکس کی رو میں تا راج ہیں وہ

نہ پاس اُن کے چادر نہ بستر ہے گھر کا — نہ برتن ہیں گھر کے نہ زیور ہے گھر کا
نہ چاقو نہ قینچی نہ نشتر ہے گھر کا — صراحی ہے گھر کی نہ ساغر ہے گھر کا
کنول مجلسوں میں قلم دفتروں میں

اثاثہ ہے سب عاریت کا گھروں میں

جو مغرب سے آئے نہ مال تجارت		تو مر جائیں بھوکے وہاں اہل حرفت
ہو تجّار پر بند راہِ معیشت		دکانوں میں ڈھونڈی نہ پائے بضاعت

پرائے سہارے ہیں بیو پارواں سب
طفیلی ہیں سیٹھ اور تجّارواں سب

یہ ہیں ترک تعلیم کی سب سزائیں		وہ کاش اب بھی غفلت سے باز اپنی آئیں
مبادارہِ عافیت پھر نہ پائیں		کہ ہیں بے پناہ آنے والی بلائیں

ہوا بڑھتی جاتی سرِ رہ گذر ہے
چراغوں کو فانوس بن اب خطر ہے

لیے فرد بخشی دوراں کھڑا ہے		ہر اک فوج کا جائزہ لے رہا ہے
جنھیں ماہر اور کرتبی دیکھتا ہے		انھیں بخشتا تیغ و طبل ولوا ہے

پہ ہیں بے ہنر یک قلم چھٹتے جاتے
رسالوں سے نام اُن کے ہیں کٹتے جاتے

بس علم و فن کے وہ پھیلاؤ ساماں		کہ نسلیں تمھاری بنیں جن سے انساں
غریبوں کو راہِ ترقی ہو آساں		امیروں میں ہو نور تعلیم تاباں

کوئی ان میں دنیا کی عزت کو تھامے
کوئی کشتیِ دین و ملت کو تھامے

بنے قوم کھانے کمانے کے قابل		زمانے میں منہ کو دکھانے کے قابل

سمجھنے لگیں اپنے سب نیک و بد وہ
لگیں کرنے آپ اپنی اپنی مدد وہ

کرو قدر اُن کی ہنر جن میں پاؤ		ترقی کی اور اُن کو رغبت دلاؤ
دل اور حوصلے ان کے مل کر بڑھاؤ		ستوں اس کھنڈر گھر کے ایسے بناؤ

کوئی قوم کی جن سے خدمت بن آئے
بٹھائیں انھیں سر پہ اپنے پرائے

کروگے اگر ایسے لوگوں کی عزّت		تو پاؤگے اپنے میں تم اک جماعت
بڑھائے گی جو قوم کی شان و شوکت		گھرانوں میں پھیلائے گی خیر و برکت

مدد جس قدر تم سے وہ آج لے گی
عوض تم کو کل اُس کا دہ چندے دے گی

ترقی کے یوناں کے اسباب کیا تھے		ہنر پر جہاں پیر و برنا فدا تھے
تمدّن کے میداں میں زور آزما تھے		وطن کی محبت میں یکسر فنا تھے

مقاصد بڑے اور ارادے تھے عالی
نہ تھا اس سے چھوٹا بڑا کوئی خالی
سب کچھ نہ تھا اس کا جز قدر دانی   کہ ہوتے تھے جو علم و حکمت کے بانی
ترقی میں کرتے تھے جو جاں فشانی   حیات اُن کو ملتی تھی واں جاودانی
وطن جیتے جی اُن پہ قرباں تھا سارا
پس از مرگ پجتے تھے وہ آشکارا
اسی گُر نے تھا جوش سب کو دلایا   کہ تھا اک جزیرے نے رُتبہ یہ پایا
اسی شوق نے تھا دلوں کو بڑھایا   اسی نے تھا یوناں کو یوناں بنایا
اس اُمید پر کوششیں تھیں یہ ساری
کہ ہو قوم کے دل میں عظمت ہماری
جنھیں ملک میں اپنی رکھنی ہو رفعت   جنھیں سلطنت کی ہو مطلوب قربت
جنھیں تھا منی ہو گھرانے کی عزّت   جنھیں دین کی ہو نہ منظور ذلّت
جنھیں نسل و اولاد ہو اپنی پیاری
اُنھیں فرض ہے قوم کی غم گساری
بہت دل ہیں نرم ان دنوں ہوتے جاتے   کہ حالت پہ ہیں قوم کی اُمڈے آتے
تنزل پہ ہیں اُس کے آنسو بہاتے   نہیں آپ کچھ کرکے لیکن دکھاتے
خبر بھی ہے دل اُن کے جلتے ہیں کس پر
وہ ہیں آپ ہی ہات ملتے ہیں جس پر
رئیسوں کی جاگیر داروں کی دولت   فقیہوں کی دانش وروں کی فضیلت
بزرگوں کی اور واعظوں کی نصیحت   ادیبوں کی اور شاعروں کی فصاحت
جچے تب کچھ آنکھوں میں اہل وطن کے
جو کام آئے بہبود میں انجمن کے
جماعت کی عزّت میں ہے سب کی عزّت   جماعت کی ذلّت میں ہے سب کی ذلّت
رہی ہے نہ ہرگز رہے گی سلامت   نہ شخصی بزرگی، نہ شخصی حکومت
وہی شاخ پھولے گی یاں اور پھلے گی
ہری ہوگی جڑ اس گلستاں میں جس کی
ذخیرہ ہے جب چیونٹا کوئی پاتا   تو بھاگا جماعت میں ہے اپنی آتا
اُنھیں ساتھ لے لے کے ہے یاں سے جاتا   فتوح اپنی ایک ایک کو ہے دکھاتا
سدا اُن کے ہیں اس طرح کام چلتے
کمائی سے ایک ایک کی لاکھوں ہیں پلتے

جب اِک چیونٹا جس میں دانش نہ حکمت | بنی نوع کی اپنے برلائے حاجت
معیشت سے ایک ایک کو بخشے فراغت | کرے اُن پہ وقف اپنی ساری غنیمت
تو اس سے زیادہ ہے بے غیرتی کیا
کہ ہو آدمی کو نہ پاس آدمی کا

غضب ہے کہ جو نوع ہو سب سے برتر | گنے آپ کو جو کہ عالم کا سرور
فرشتوں سے جو سمجھے اپنے کو بڑھ کر | خدا کا بنے جو کہ دنیا میں مظہر
نہ ہو مردمی کا نشاں اُس میں اتنا
مسلم ہے مٹی کے کیڑوں میں جتنا

الٰہی بحقِ رسولِ تہامی | ہر ایک فرد انساں کا تھا جو کہ حامی
جسے دور و نزدیک تھے سب گرامی | برابر تھے مکّی و زنگی و شامی
شریروں کو ساتھ اپنے جس نے نباہا
بُروں کا ہمیشہ بھلا جس نے چاہا

طفیل اُس کا اور اس کی عزّت کا یا رب | پکڑ ہات جلد اُس کی اُمّت کا یا رب
اک ابر اس پہ بھیج اپنی رحمت کا یا رب | غبار اس سے جو دھو دے ذلّت کا یا رب
کہ ملّت کو ہے ننگ ہستی سے اُس کی
ہوا پست اسلام پستی سے اُس کی

بچا اُن کو اس تنگنائے بلا سے | کہ رستہ ہو گم رہر و رہنما سے
نہ اُمید یاری ہو یار آشنا سے | نہ چشم اعانت ہو دست و عصا سے
چپ و راست چھائی ہوئی ظلمتیں ہوں
دلوں میں اُمیدوں کی جا حسرتیں ہوں

اُنھیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے | ذرا اُن کی آنکھوں سے پردہ اُٹھا دے
کمیں گاہِ بازی دوراں دکھا دے | جو ہونا ہے کل آج اُن کو سجھا دے
چھتیں پاٹ لیں تاکہ باراں سے پہلے
سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے

8.4.2 تشریح ''انتخاب مسدّس حالؔی''

خواجہ الطاف حسین حالؔی کی مشہور و معروف نظم ''مد و جزر اسلام'' یا ''مسدّس حالؔی'' ہے۔ انتخاب ''مسدّس حالؔی'' میں انھوں نے قوم و ملّت کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے علم و ہنر کے حصول اور اس کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیا ہے۔ یہ نظم مسدّس کی ہیئت میں ہے۔

پہلے بند میں حالؔی نے تعلیم کی قدر و قیمت کو واضح کیا ہے کہ جو لوگ تعلیم کی قدر نہیں جانتے، ذلّت اور رسوائی ان پر مسلّط

ہوجاتی ہے۔علم وہنر کی عدم موجودگی میں بادشاہوں نے حکومتیں گنوادیں۔امیروں کے گھروں میں نحوست چھا گئی۔جولوگ خاندانی تھے اپنے حسب ونسب پر فخر کرتے تھے،ان کی شرافت کے سارے دعوے علم وہنر نہ ہونے کی وجہ سے جھوٹے ثابت ہوئے۔

دوسرے بند میں حالؔی عصری زندگی کے تقاضوں کے تحت یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اب تعلیم کے بغیر کسی بھی پیشے میں خواہ وہ کاریگری ہو،سوداگری ہو یا کوئی اور کاروبار، زندگی میں کامیابی نہیں مل سکتی۔جن کے پاس کبھی دولت ہوا کرتی تھی وہ عصر حاضر میں اب بے کار اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

تیسرے بند میں حالؔی تعلیم کی ناقدری کے بُرے اثرات کا ذکر کرتے ہیں کہ اب ہنر وفن کے ماہر روز بروز کم ہورہے ہیں۔طبیبوں کے مطب اور ادیبوں کی علمیت اور فضیلت گھٹتی جارہی ہے۔جولوگ فلسفے اور مناظرے میں چست درست تھے وہ بھی اب پست ہو گئے ہیں۔نہ نظم کہنے والے بچے ہیں اور نہ نثر لکھنے والے۔

چوتھے بند میں حالؔی نے قوم کی محتاجی کا ذکر کیا ہے۔کہتے ہیں کہ ہم ایک ٹوپی بھی غیروں کی مدد کے بغیر نہیں بنا سکتے۔ہم روزمرہ زندگی میں کام آنے والی چھوٹی چیز کے لیے مغرب یعنی ترقی یافتہ قوموں کے محتاج ہو گئے ہیں۔تعلیم کی ناقدری نے ہماری صنعت وحرفت اور ہماری مہارت کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔

پانچویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ قوم کی تباہی و بربادی کا عالم یہ ہے کہ روزمرّہ کی ضرورتوں کے ہر سامان کے لیے ہم دوسروں کے محتاج ہیں اور ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں۔قوم کے پاس جو بھی ساز وسامان ہے وہ غیروں سے مستعار ہے۔

چھٹے بند میں شاعر کہتا ہے کہ اگر مغربی ممالک سے مال تجارت نہ آئے تو کاریگر بھوکوں مر جائیں، تاجروں کی مالی حالت خراب ہو جائے۔دکانوں کی پونجی ختم ہو جائے۔یہاں سارا نظام غیروں کے سہارے ہے۔یہاں امیر اور تاجر بھی غیروں کے ہی محتاج ہیں۔

ساتویں بند میں حالؔی کہتے ہیں کہ قوم کی بدحالی اور تباہی کی بنیادی وجہ ترک تعلیم اور علم وہنر کی ناقدری ہے۔اگر قوم اب بھی خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوئی تو شاید پھر اسے آرام اور سکون نصیب نہ ہوگا کیوں کہ مستقبل میں اور بھی سخت منزلیں آنے والی ہیں۔

آٹھویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ وقت کا سپاہی رجسٹر ہاتھ میں لیے ہر ایک قوم کا جائزہ لے رہا ہے۔یعنی سیاسی وسماجی تغیرات میں وہی قوم قدر ومنزلت حاصل کرے گی جو علم وفن سے بہرہ ور ہوگی اور وہی قوم دنیا پر حکومت کرے گی۔جو قوم خواب غفلت میں علم وفن سے کنارہ کشی اختیار کرے گی اسے ذلّت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا اور ان کا کوئی نام لیوا نہیں رہے گیا۔

نویں بند میں حالؔی نے قوم کو مخاطب کرتے ہوئے انھیں علم وفن کے حصول کی ترغیب دی ہے تاکہ آنے والی نسلیں اس سے آراستہ ہو کر ترقی کر سکیں۔غربت وافلاس کا خاتمہ ہو اور امیروں کے یہاں بھی علم کی روشنی پھیلے۔قوم وملّت علم وہنر کے اکتساب کے ذریعے ہی ترقی، بلندی اخلاق اور اعلیٰ کردار پیدا کرے تاکہ اسے دین اور دنیا میں بلند مرتبہ حاصل ہو۔

دسویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ اگر قوم علم وفن کی روشنی سے مزین ہو جائے تو اسے اقوام کے مابین عزت واحترام حاصل ہو۔وہ ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بشانہ چلنے کے قابل ہو سکے۔اُسے آدمیت کا خطاب میسر ہو۔اس کے اندر اچھے اور برے کی تمیز پیدا ہو اور وہ خود اپنی مدد آپ کرنے کے قابل ہو جائے۔

گیارہویں بند میں حالؔی کہتے ہیں کہ ہمیں ہنرمند افراد کی قدر کرنی چاہیے۔انھیں مزید ترقی حاصل کرنے کے لیے راغب کرنا چاہیے۔مل جل کر ان کا حوصلہ بڑھانا چاہیے۔جولوگ قوم وملّت کی خدمت کرتے ہیں انھیں اپنے اور غیر سبھی عزت

کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

بارہویں بند میں حالؔی کہتے ہیں کہ اگر ہم علم وفن سے آراستہ افراد کی عزت اور قدر کریں گے تو ہمارے درمیان آہستہ آہستہ اتفاق واتحاد پیدا ہوگا، ایک جماعت بنے گی جو قوم کی شان وشوکت بڑھانے اور گھروں میں خیر و برکت کے لیے معاون ثابت ہوگی اور اس کا فائدہ آنے والی نسلیں بھی اُٹھائیں گی۔

تیرہویں بند میں شاعر نے یونانی تہذیب وتمدن کی برتری اور ترقی کی طرف اشارہ کیا ہے اور سوال قائم کیا ہے کہ آخر یونان کی ترقی کے اسباب کیا تھے اور جواب میں کہتے ہیں کہ وہاں خواہ بوڑھا ہو یا نوجوان، ہر فرد علم و ہنر پر فدا تھا۔ اسے حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھا اپنی تہذیب وتمدّن کی برتری کا خواہاں تھا۔ وطن کی محبت میں خود کو نچھاور کرنے کے لیے تیار تھا۔ ان کے مقاصد عظیم اور دلوں میں مضبوط اور اعلیٰ ارادے تھے جن میں چھوٹا بڑا ہر فرد شامل تھا۔

چودہویں بند میں حالؔی یونان کی ترقی پر مزید فرماتے ہیں کہ اس ملک کی ترقی کا راز اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہاں علم و حکمت کے ماہر افراد کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جو لوگ ملک کی ترقی اور خوش حالی میں خون پسینہ بہاتے تھے انھیں حیات جاودانی ملتی تھی۔ ان کی زندگی میں قوم ان پر جان نچھاور کرتی تھی اور ان کی موت کے بعد بھی ان پوجا کی جاتی تھی۔ ان کے کارناموں کو یاد کیا جاتا تھا۔

پندرہویں بند میں حالؔی کہتے ہیں کہ ترقی اور خوش حالی کا یہی وہ طریقہ تھا جس نے ہر فرد کے دل میں جوش وجذبہ پیدا کر دیا تھا۔ وطن کی عظمت اور ترقی کے اس شوق نے یونان کو یونان بنایا تھا۔ قوم کے دل میں اپنی عظمت بیدار کرنے اور حیات جاودانی حاصل کرنے کے لیے ہر فرد کوشاں تھا جو یونان کی ترقی کا بنیادی سبب تھا۔

سولہویں بند میں حالؔی فرماتے ہیں کہ جو لوگ ملک میں بلندی پر پہنچنا چاہتے ہیں اور جو حکومت میں عمل دخل چاہتے ہیں جو اپنے خاندان کی عزت کے خواہاں ہیں اور جنھیں دین کی ذلّت اور رسوائی منظور نہیں ہے۔ جو اپنی نسل اور اولاد سے محبت کرتے ہیں، ان کے لیے لازم ہے کہ وہ قوم کے دکھ درد اور اس کی ضرورتوں اور تقاضوں کو سمجھیں۔

سترہویں بند میں حالؔی نے قوم کی بدحالی اور تنزلی پر دل بھر آنے اور مغموم ہونے کا ذکر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ اس ناگفتہ بہ صورتحال میں بھی قوم عملی تدبیر سے دور ہے۔ صرف آنسو بہانے اور رنج وافسوس سے قوم کی بدحالی ختم نہیں ہوگی بلکہ قوم کو اس مصیبت سے باہر نکالنے کے لیے عملی جدوجہد کی ضرورت ہے۔

اٹھارہویں بند میں حالؔی کہتے ہیں کہ رئیسوں اور جاگیرداروں کی دولت، عالموں اور دانشوروں کی بزرگی اور برتری، بزرگوں اور واعظوں کی نصیحت، ادیبوں اور شاعروں کی شیریں کلامی اگر وطن کے لوگوں کی فلاح و بہبود میں کام آ سکے تبھی اس کی اہمیت اور افادیت ہے۔

انیسویں بند میں حالؔی کہتے ہیں کہ اتحاد واتفاق ہی قوم کی سربلندی کا سبب ہے اور آپسی نفاق سے ذلّت اور رسوائی ملتی ہے کیوں کہ شخصی بزرگی اور شخصی حکومت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ دنیا میں وہی قوم سرفراز وسربلند ہوگی جو اتحاد واتفاق کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہوگی۔

بیسویں بند میں حالؔی نے اخلاق آموز نصیحت کی ہے کہ جب ایک چیونٹا کوئی ذخیرہ دیکھتا ہے تو پہلے جا کر اپنی جماعت میں بتاتا ہے۔ پھر سب کو ساتھ لے کر وہاں جاتا ہے اور اپنی کامیابی پر خوش ہوتا ہے۔ ایک چیونٹا کوئی کھانے کا ذخیرہ تلاش کرتا ہے اور سب اسے مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔ ان کا ہمیشہ اسی طرح کام چلتا رہتا ہے۔

اکیسویں بند میں حالیؔ اس اخلاقی نصیحت کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک چیونٹا جس کے اندر نہ دانش ہے اور نہ حکمت۔ اس کے باوجود وہ اپنی جماعت کی حاجت پوری کرتا ہے۔ اس کی کامیابی سے پوری جماعت کو آرام نصیب ہوتا ہے۔ وہ اپنی دولت سب پر نچھاور کرتا ہے۔ انسان جو اشرف المخلوقات ہے اس کے لیے اس سے زیادہ بے حسی اور بے غیرتی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی کو آدمی کا لحاظ اور اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کا خیال نہ ہو۔

بائیسویں بند میں حالیؔ نے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ انسان جو تمام جانداروں میں برتر، پوری دنیا کا حاکم، فرشتوں سے بڑھ کو اور دنیا میں جو خدا کا مظہر بنتا ہے اس میں مٹی کے کیڑوں جتنی بھی بہادری اور فیاضی نہیں ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہونے کا فرض ادا کر سکے۔

تیئسویں بند میں حالیؔ نے محمدؐ کے حسن اخلاق کا ذکر کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ محمدؐ ہر انسان کے حامی و مددگار تھے۔ انھوں نے اپنے اور پرائے میں کبھی کوئی فرق نہیں کیا اور جن کے نزدیک دنیا کا ہر شخص خواہ وہ کسی ملک، قوم، رنگ یا نسل کا ہو، برابر تھا۔ جس نے شریر لوگوں کے ساتھ بھی نباہ کیا اور بُرے لوگوں کا بھی ہمیشہ بھلا چاہا۔

چوبیسویں بند میں حالیؔ فرماتے ہیں کہ اے خدا تو محمدؐ کے صدقے میں ان کی اُمت کو صحیح راستہ دکھا۔ اپنی رحمت کا ایک ابر بھیج دے تا کہ مسلمانوں کی بدحالی اور ذلّت کا خاتمہ ہو۔ کیوں کہ مسلمانوں کی زبوں حالی، قوم وملّت کی بدنامی کا سبب ہے اور اسلام بھی مسلمانوں کی تباہی اور بربادی سے پست ہے۔

پچیسویں بند میں شاعر پھر خدا سے مخاطب ہے اور کہتا ہے کہ اے خدا تو مسلمانوں کو تباہ و برباد ہونے سے بچالے کیوں کہ نہ ان کا کوئی قائد ہے اور نہ رہبر۔ اب کوئی اُمید باقی نہیں بچی ہے۔ ان کے دائیں بائیں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور دلوں میں حسرتیں ہیں۔ اب صرف ایک تیری ہی ذات ہے جو انھیں اس تنزلی اور مصیبت سے باہر نکال سکتی ہے۔

چھبیسویں اور آخر بند میں حالیؔ خدا سے مخاطب ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ اے خدا تو مسلمانوں میں مستقبل کی فکر پیدا کر دے۔ انھیں خوابِ غفلت سے بیدار کر دے۔ زمانے کے تغیرات اور بدلتے ہوئے حالات ان پر واضح کر دے تا کہ مستقبل میں آنے والی کٹھن منزلوں سے وہ آشنا ہو جائیں اور اس سے مقابلہ کرنے کے لیے خود کو تیار کرنے کی کوشش کریں اور طوفان کی آمد سے پہلے اپنی کشتی بنالیں۔

8.4.3 ''انتخاب مسدّس حالیؔ'' کا تجزیہ

''مسدّس حالیؔ'' یا نظم ''مدوجزر اسلام'' خواجہ الطاف حسین حالیؔ کی شہرہ آفاق نظم ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے جو مسدّس کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ 1857ء کے انقلاب کے بعد ہندوستانی عوام خصوصاً مسلمانوں کی زبوں حالی اپنے عروج پر تھی۔ مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں پچھڑے ہوئے تھے۔ ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ایسے پرآشوب دور میں سرسید نے مسلمانوں کو تباہی و بربادی سے بچانے کے لیے تعلیمی، معاشرتی اور سماجی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے قوم وملّت کی تاریخ، تہذیب و معاشرت، مذہب وسیاست کے علاوہ شعروادب کو بھی اس اصلاحی مشن کا حصّہ بنایا۔ شعروادب کی افادیت اور مقصدیت پر زور دیا۔ حالیؔ سرسید کے ہم نوا اور سچّے رفیق تھے۔ قوم کی ناگفتہ بہ حالت نے ان کے اندر بے چینی پیدا کر رکھی تھی۔ لہٰذا سرسید کی فرمائش پر انھوں نے ایک طویل نظم 'مدوجزر اسلام' لکھی جو 'مسدّس حالیؔ' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس نظم میں اسلام کی آمد سے قبل عرب قوم کی جاہلیت اور بربریت، طلوع اسلام کے بعد کی صورتحال نیز مسلمانوں کی ترقی اور پھر زمانے کے تغیرات کے ساتھ

مسلمانوں کی زبوں حالی کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظم 1857ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی اوران کی اصلاح کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ حالؔی کی اس نظم نے ہندوستانی مسلمانوں کوخوابِ غفلت سے بیدار ہونے ،غور وفکر کرنے ، ماضی کی شاندار روایتوں سے سبق حاصل کر کے زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے اور جوش وجذبہ اور نیا حوصلہ پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

اس نظم میں حالؔی کا قومی وملّی شعور اپنے عروج پر ہے۔انھوں نے نہایت سنجیدگی ،متانت ،صداقت اورخلوص ودردمندی کے ساتھ اپنے جذبات وخیالات کا اظہار کیا ہے۔سرسید ''مسدّس حالؔی'' سے بے حد متاثر تھے۔ بقول سرسید:

''بے شک میں اس کا محرک ہوا ہوں اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا تو دنیا سے کیا لایا؟ میں کہوں گا میں حالؔی سے ''مسدّس'' لکھوا کر لایا ہوں اور کچھ نہیں۔''

''انتخاب مسدّس حالؔی'' میں حالؔی نے قوم وملّت اور اہل وطن کی ترقی اور فلاح کے لیے علم وفن کی اہمیت اور افادیت کو اخلاق آموز باتوں اور مثالوں کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔خلوص اور دردمندی ان کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

حالؔی نے انتخاب مسدّس میں اس حقیقت کو آشکارا کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو قوم تعلیم کی قدر و قیمت نہیں جانتی اور اس سے کنارہ کشی اختیار کرتی ہے اسے ذلّت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر اسے ناکامی اور نامرادی حاصل ہوتی ہے۔

حالؔی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ترک تعلیم ہی کی وجہ سے اہل وطن ترقی یافتہ اقوام کے محتاج ہو گئے ہیں اور اپنی ہر چھوٹی بڑی ضرورت کے لیے دوسروں کی طرف مُنھ اُٹھا کر دیکھتے ہیں۔ جو قوم وقت اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہوتی، ذلّت اور تنزلی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

یہ نظم حالؔی کے وطنی ،قومی ،سماجی اور سیاسی شعور کا بین ثبوت ہے۔اس نظم کی معنویت آفاقی حیثیت کی حامل ہے۔اس نظم نے اردو شاعری کے لیے نئے معیار اور نئی سمت کا تعین کیا جس سے اردو نظم نگاری کو وسعت ملی۔اس نظم کی افادیت اور خصوصیت کے متعلق رام بابو سکسینہ رقم طراز ہیں:

''یہ ایک الہامی کتاب ہے۔اس کو تاریخ ارتقائے ادب اردو میں ایک سنگ نشان سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک تارا ہے جو اردو کے افق شاعری پر طلوع ہوا۔اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی۔ انتخاب مسدّس حالؔی کے اشعار مسلمانوں کی تنزلی کے اسباب کو صداقت اور حقیقت پسندی کے ساتھ اجاگر کرتے ہیں۔ جذبہ وخیال میں خلوص وصداقت اور دل گدازی ہی اس نظم کی اثر آفرینی کا بنیادی سبب ہے۔''

حالؔی عملی جدوجہد اور آپسی اتحاد واتفاق کو قوم کی بھلائی اور ترقی کے لیے اہم قرار دیتے ہیں۔عملی زندگی میں ہر سطح پر مسلمانوں کی بے عملی، لا پرواہی اور بے حسی ان کی رسوائی اور بربادی کی بنیادی وجہ تھی۔ حالؔی نے 'انتخاب مسدّس' میں اخلاق آموز باتوں اور ترقی یافتہ قوموں کی برتری اور ترقی کے اسباب بتا کر مسلمانوں کو راہ راست پر لانے اور عملی جدوجہد کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کائنات میں انسان کو اشرف المخلوقات کی حیثیت حاصل ہے اور حالؔی چاہتے ہیں کہ انسان اپنے عمل، حسن اخلاق اور اعلیٰ کردار سے اس کا ثبوت فراہم کرے۔ حالؔی نے محمدؐ کی سیرت کے وسیلے سے مسلمانوں کو ان کے دینی اور دنیاوی فرائض یاد

دلانے کی کوشش کی ہے تا کہ سماج ومعاشرے میں وہ قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جائیں اور کامیابی وکامرانی سے ہمکنار ہوں۔

حالؔی نے اس شاہکار نظم میں مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ علم و ہنر ہی وہ ذریعہ ہے جس سے آراستہ ہوکر قوم وملّت میں اتحاد پیدا ہوسکتا ہے، وہ ترقی کے راستے پر قدم بڑھا سکتی ہے اور اس کے اندر بلندی اخلاق اور اعلیٰ کردار پیدا ہو سکتے ہیں۔ان خوبیوں کے ساتھ قوم عصری تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال سکتی ہے اور ایک زندہ قوم ہونے کا ثبوت پیش کرسکتی ہے۔

'انتخاب مسدّس حالؔی' میں عام فہم الفاظ میں سادگی، سلاست، روانی، صداقت، خلوص اور درمندی کے ساتھ حالؔی نے حالات ومسائل پر روشنی ڈالی ہے۔اس نظم میں قوم کی اصلاح کا جذبہ پوری طرح کارفرما ہے۔

'مسدّس حالؔی' اپنی معنویت اور جذبہ وخلوص کی صداقت کی بنا پر آج بھی اہمیت کی حامل ہے اور اس کی یہی خوبی اس کی آفاقیت اور عالم گیر شہرت کا واضح ثبوت ہے۔یہ نظم فکر وفن کا حسین امتزاج ہے۔

8.5 خلاصہ

خواجہ الطاف حسین حالؔی اردو شعر و ادب میں ممتاز اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف بلند پایہ شاعر، نثر نگار، نقاد اور سوانح نگار تھے بلکہ مصلح قوم بھی تھے۔ وہ ایک واضح سماجی و سیاسی شعور رکھتے تھے جس کی روشنی میں انھوں نے اپنے عہد کے حالات ومسائل کی عکاسی خلوص، دردمندی اور حقیقت پسندی کے ساتھ کی ہے۔ حالؔی کا شمار قومی اور نیچرل شاعری کے بانیوں میں ہوتا ہے۔

حالؔی 1837ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔بچپن سے ہی انھیں مطالعے کا شوق تھا اور دلّی آنے کے بعد انھیں مصطفیٰ علی خاں شیفتؔہ اور غالبؔ کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا اور ان کے ادبی ذوق وشوق کی آبیاری ہوئی۔سرسید کی ہم نوائی میں انھوں نے شاعر، ادیب اور مصلح کی حیثیت سے جو کارنامے اور خدمات انجام دیں وہ نا قابل فراموش ہیں۔

جدید اردو نثر کو پروان چڑھانے میں بھی حالؔی نے اہم کردار ادا کیا۔'مقدمہ شعر وشاعری' تصنیف کرکے انھوں نے اردو تنقید کو نئی راہ دکھائی۔'مقدمہ شعر وشاعری' اردو تنقید کی تاریخ میں بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔حیات سعدی (شیخ سعدی)، یادگار غالبؔ (مرزا غالبؔ) اور حیات جاوید (سرسید احمد خاں)، حالؔی کی اہم سوانحی تصانیف ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے شخصی مرثیے بھی لکھے جن میں غالبؔ کا مرثیہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

حالؔی شعر وادب کی مقصدیت اور افادیت کے حامی تھے۔انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے قوم کو صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کی۔انسان دوستی، قوم پرستی، خودداری، صداقت وخلوص اور حقیقت پسندی ان کی تخلیقات کی بنیادی خصوصیات ہیں۔

حالؔی کی زبان سادہ، سلیس اور رواں دواں ہے۔انھوں نے عام فہم انداز میں اپنے جذبات واحساسات اور تجربات و مشاہدات کو شعر وادب میں پیش کیا ہے۔قومی، اخلاقی اور اصلاحی موضوعات پر انھوں نے کئی اہم نظمیں لکھی ہیں۔اس ضمن میں 'مسدّس حالؔی' (مدوجزر اسلام)، مناجات بیوہ، حب وطن، مناظرہ رحم وانصاف، چپ کی داد، مٹی کا دیا وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

مولانا حالؔی بلا شبہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔انھوں نے اردو شعر وادب کو نئی بلندیوں پر پہنچانے میں نا قابل فراموش کارنامے انجام دیے ہیں۔

8.6 نمونۂ امتحانی سوالات

۱۔خواجہ الطاف حسین حالؔی کی زندگی کے حالات پر ایک مضمون قلم بند کیجیے؟
۲۔'انتخاب مسدّس حالؔی' کے پہلے تین بند کا تجزیہ پیش کیجیے؟
۳۔'انتخاب مسدّس حالؔی' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے ؟
۴۔حالؔی کی شاعری کی اہم خصوصیات بیان کیجیے؟

8.7 فرہنگ

الفاظ	معنی
پیش خیمہ	کسی واقعہ کی تمہید، پیادہ
ممتاز	معزز، اعلیٰ، افضل
تگ ودو	دوڑ دھوپ، کوشش
پوشیدہ	چھپا ہوا
کلیدی	بنیادی
مشعل راہ	راہ کا چراغ، راستہ دکھانے والا
بالغ النظر	ذہین، تجربہ کار، سمجھ دار
ناگفتہ بہ	ناقابل بیان
شاہکار	سب سے بڑا کارنامہ
حساس	زیادہ محسوس کرنے والا
تغیرات	تغیر کی جمع ،تبدیلی
غم خوار	ہمدرد، دکھ درد میں شامل ہونے والا
آفاقی	ساری دنیا کا، عالم گیر
آفاقیت	ہر زمانے کا
حامل	بوجھ اٹھانے والا، کسی چیز کو لے جانے والا
مسلّط	سوار، قابض
سلاطین	سلطان کی جمع، بادشاہ
نکبت	نحوست، منحوس
ناثر	نثر لکھنے والا
تاراج	تباہ و برباد
کنول	روشنی کرنے والا شیشہ
اثاثہ	سامان، اسباب

عاریت	مانگا ہوا
حرفت	کاریگر
تجار	تاجر کی جمع
معیشت	روزگار، روزی
بضاعت	پونجی
ترک	چھوڑنا
مبادا	شاید
عافیت	آرام، سکون
فانوس	شمع دان، ایک طرح کی قندیل
فرد	رجسٹر، فہرست، ایک آدمی
بخشی دوراں	زمانے کا سپاہی
طبل	ڈھول
لوا	علم، جھنڈا
رغبت	خواہش
اسباب	سبب کی جمع، وجہ
پیر	بوڑھا
برنا	نوجوان
جاں فشانی	جی توڑ محنت
جاودانی	ہمیشگی
پس از مرگ	مرنے کے بعد
آشکارا	ظاہر
گُر	طریقہ
عظمت	بڑائی، برتری
رفعت	بلندی
قربت	نزدیک
مطلوب	طلب کرنا، خواہش
غم گساری	غم خواری، ہمدردی
تنزل	زوال
فضیلت	بزرگی
فصاحت	شیریں کلامی

بہبود	بھلائی، فلاح
ذخیرہ	خزانہ، کسی چیز کا ڈھیر
فتوح	کامیابی
دانش	علم
حکمت	فلسفہ
غنیمت	دولت، مفت ملی ہوئی چیز
نوع	قسم
سرور	سردار
مظہر	ظاہر کرنے والا
مردمی	بہادری
مکّی	مکّہ کا رہنے والا
طفیل	ذریعہ، وسیلہ، بدولت
ننگ	بدنامی
یار آشنا	دوست
اعانت	مہربانی
عصا	لاٹھی
چپ وراست	بائیں دائیں
کمین گاہ	گھات کی جگہ
بازی دوراں	زمانے کا کھیل
باراں	بارش
سفینہ	کشتی، جہاز

8.8 سفارش کردہ کتابیں:

حالؔی بہ حیثیت شاعر — شجاعت علی سندیلوی
حالؔی اور نیا تنقیدی شعور — اختر انصاری
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ — سید احتشام حسین
حالؔی: ایک عہد ساز فن کار — زرینہ عقیل

اکائی:9 اکبرالہ آبادی۔۔۔مستقبل

ساخت:

9.1 اغراض ومقاصد
9.2 تمہید
9.3 اکبرالہ آبادی کا تعارف
9.3.1 حالات زندگی
9.3.2 شاعری کی خصوصیات
9.4 اکبرالہ آبادی کی نظم ''مستقبل''
9.4.1 متن
9.4.2 تشریح
9.4.3 تجزیہ
9.5 خلاصہ
9.6 نمونۂ امتحانی سوالات
9.7 فرہنگ
9.8 سفارش کردہ کتابیں

9.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں اکبرالہ آبادی کی زندگی کے حالات اور ان کی شاعری بالخصوص نظم گوئی کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور ان کی نظم ''مستقبل'' کی تشریح اور اس کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

اس اکائی کے مطالعے کی بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ:

☆ اکبرالہ آبادی کی زندگی کے حالات اور شاعرانہ خصوصیات پر اظہار خیال کر سکیں۔
☆ اکبرالہ آبادی کی نظم ''مستقبل'' کی تشریح کر سکیں۔
☆ نظم ''مستقبل'' کا تجزیہ اور خلاصہ بیان کر سکیں۔

9.2 تمہید

اکبرالہ آبادی کو اردو نظم کی نشو نما اور فروغ میں منفرد مقام حاصل ہے۔ اکبر نے اردو نظم نگاری میں ایک نئے طرز یعنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے طنز ومزاح کو سماج اور معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔

اکبرالہ آبادی حالؔی اورشبلی کے ہم عصر تھے۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستانی عوام انگریزی حکومت کی بربریت اور جبر وظلم کے شکار تھے اور انگریز سماجی اور معاشی سطح پر ان کا ہر طریقے سے استحصال کررہے تھے۔ مغربی تہذیب وتمدن آہستہ آہستہ مشرقی اقدار وروایات پر حاوی ہوتا جارہا تھا۔ ان حالات میں ہندوستان کا تعلیم یافتہ اور دانشور طبقہ ہندوستانی عوام کی سماجی ومعاشرتی اصلاح کے لیے کوشاں تھا۔ سماج اور معاشرے میں ہر سطح پر اصلاحی تحریکیں چل رہی تھیں۔ مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے لیے بھی سرسید اور ان کے رفقا اپنی کوششوں کا آغاز کرچکے تھے۔ اسی عہد میں اکبر نے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ وہ سرسید کے افکار ونظریات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ اکبر مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ انھوں نے اپنے ادبی نظریے سے سماج اور معاشرے کے حالات ومسائل کو سمجھنے اور پرکھنے کی سعی اور اپنی طنز وظرافت اور شاعرانہ تفکر سے قومی اور سماجی اصلاح کی کوشش کی۔ اردو نظم نگاری میں اکبرالہ آبادی ایک منفرد اسلوب کے بانی ہیں۔

9.3 اکبرالہ آبادی کا تعارف

9.3.1 حالات زندگی

طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں امتیازی شان کے حامل اکبر الہ آبادی کا پورا نام سید اکبر حسین رضوی اور اکبر تخلص تھا۔ اکبر کی پیدائش 16 ؍نومبر 1846ء میں بارہ ضلع الہ آباد میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سید تفضّل حسین تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر والد کی نگرانی میں ہوئی اس کے بعد پہلے مکتب گئے پھر ان کا داخلہ جمنا مشن اسکول میں ہوا۔ بچپن سے ہی انھیں پڑھنے کا شوق تھا۔ لیکن ان کی تعلیم کا سلسلہ بہت دیر تک جاری نہیں رہ سکا۔ 1857ء کے انقلاب کے بعد ہندوستان کے بدلے ہوئے سماجی وسیاسی ماحول میں انھیں تعلیم ترک کرکے چھوٹی موٹی ملازمتیں کرنی پڑیں۔ 1866ء میں انھوں نے مختاری کا امتحان دیا اور اس میں کامیاب ہوکر نائب تحصیل دار کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1870ء میں انھیں ہائی کورٹ میں نوکری ملی۔ بچپن سے ہی انھیں تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا لہٰذا وکالت کی پڑھائی کرنے کے بعد کچھ دنوں تک وکالت کی اور پھر منصف اور سیشن جج بھی بنے۔ 1903ء تک وہ عدالت سے وابستہ رہے۔ اکبر کو زندگی کے آخری دور میں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ 9 ستمبر 1921ء کو الہ آباد میں ان کی موت ہوئی اور یہیں دفن کیے گئے۔

اکبر بلا کے ذہین تھے اور انھیں بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ شاعری کا آغاز روایتی انداز میں غزل گوئی سے کیا لیکن نظم گوئی میں طنز ومزاح کے بنیاد گزار کی حیثیت سے انھیں شہرت دوام حاصل ہوا۔ اکبرالہ آبادی شاعری میں غلام حسین وحید الہ آبادی کے شاگرد تھے۔ اکبر کی زندگی میں کلیات اکبر کی تین جلدیں شائع ہوئی تھیں۔ چوتھی جلد ان کے انتقال کے بعد پہلی بار 1948ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ اکبر نے اپنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے ذریعے مغربی تعلیم اور تہذیب وتمدن کی اندھی تقلید پر چوٹ کی۔ وہ اسے ہندوستانی معاشرے کے لیے سودمند نہیں سمجھتے تھے۔

اپنی معلومات کی جانچ

۱۔ اکبرالہ آبادی کا پورا نام کیا تھا اور وہ کب پیدا ہوئے؟

۲۔ اکبرالہ آبادی کے والد کا کیا نام تھا؟

۳۔ اکبر کے ایک ہم عصر شاعر کا نام بتائیے؟

۴۔ اکبر کی وفات کب ہوئی؟

9.3.2 شاعری کی خصوصیات

اردو نظم نگاری کو ایک منفرد اسلوب اور طرز فکر سے روشناس کرانے میں اکبر الہ آبادی کا نام سرفہرست ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اپنے شعری سفر کا آغاز غزل گوئی سے کیا۔ ان کے کلام میں غزلوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے اور ان کے کئی اشعار آج بھی مختلف موقعوں پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً:

ہم آہ بھی بھرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکبر الہ آبادی کو شہرت و مقبولیت نظم گوئی میں طنزیہ اور مزاحیہ اسلوب بیان کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ اکبر کے عہد میں ہندوستان سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی تبدیلیوں کے دور سے گزر رہا تھا۔ ہندوستان پر انگریزی حکومت قائم کی تھی اور حاکم قوم، محکوم قوم کو ہر طریقے سے زیر کرنا چاہتی تھی۔ لہذا زندگی کے ہر شعبے پر انگریزوں کے طور طریقے دھیرے دھیرے اپنا اثر چھوڑ رہے تھے۔ ہندوستانی عوام بالخصوص مسلمان سماجی اور سیاسی اعتبار سے بکھر چکے تھے۔ ان کی معاشی اور تعلیمی صورت حال ناگفتہ بہ تھی۔ ایسے کٹھن دور میں سرسید اور ان کے ساتھی مسلم قوم کی اصلاح کو کوششوں میں مصروف تھے۔ اپنے عہد کے ان حالات و مسائل کا اکبر نے بغور مطالعہ و مشاہدہ اور تجربہ کیا تھا۔ اکبر کے کلام کی خصوصیات کو اس عہد کے ہندوستان کی سماجی و سیاسی صورت حال، مسلم تہذیب و ثقافت اور ہندوستانی معاشرے میں مشرقی اور مغربی تہذیب کی کشمکش اور تصادم کی روشنی میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

اکبر کی پرورش و پرداخت مشرقی ماحول و معاشرے میں ہوئی تھی اور مشرقی اقدار و روایات اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے انھیں بے حد لگاؤ تھا۔ وہ مذہب کے پابند تھے لہذا جدید تعلیم یعنی مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب و تمدن کو ہندوستانی سماج اور معاشرے کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی شاعری میں ہندوستانی سماج پر مغربی تعلیم اور اس کے اثرات کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔ سماجی اصلاح اور ترقی کے نام پر مذہب اور اپنے تہذیب و ثقافت سے بے گانگی انھیں منظور نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں انگریزی تعلیم اور مغرب پرستی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری محض ہنسی مزاق نہیں ہے بلکہ اس میں سنجیدگی اور دردمندی ہے۔ اکبر نے شاعرانہ طنز و مزاح کے ذریعے سماجی اور معاشرتی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ بقول پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی:

> ''اکبر اپنے دور کی زندگی اور اس کے مسائل کو ایک کارٹونسٹ کی نظر سے دیکھتے ہیں، ان کی نگاہ ہمیشہ مغربی اثرات کے تحت پلنے والی جدید اقدار کے مضحک پہلوؤں پر پڑتی ہے۔ اپنے تخیل کی بدولت اور زبان کی مدد سے وہ ان پہلوؤں کو اور زیادہ مضحک بنا دیتے ہیں۔ جس طرح ایک کارٹونسٹ اپنے اسکیچ میں بعض خطوط کو گھٹا بڑھا کر ان پہلوؤں کو نمایاں کر دیتا ہے جن پر طنز کرنا مقصود ہو، اسی طرح اکبر بھی نئی تہذیب کی خامیوں کو بڑی خوبی کے ساتھ اجاگر کرتے ہیں''۔

اکبر الہ آبادی نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے اپنے عہد کی تہذیبی کشمکش اور حالات و مسائل کو طنز و مزاح کے پیرائے میں

پیش کیا ہے۔اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے نوکر ہوئے پیشن ملی اور مر گئے

کیا کہوں اس کو میں بد بختیِ نیشن کے سوا
اس کو آتا نہیں اب کچھ امیٹیشن کے سوا

کر دیا کرزن نے زن مردوں کی صورت دیکھئے
آبرو چہرے کی سب فیشن بنا کر چھین لی

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

اکبرؔ سرسید کے افکار وخیالات، اصلاحی کوششوں وسرگرمیوں اور جدید طرز تعلیم کے خلاف تھے۔ سرسید چاہتے تھے کہ مسلم قوم جدید تعلیم سے آراستہ ہو کر زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھے۔ مغربی تہذیب وتمدن کے مثبت پہلوؤں سے استفادہ کرے اور تعلیمی ومعاشی اعتبار سے مستحکم ہو۔ اکبرؔ اسے سرسید کی اندھی تقلید تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان جدید تعلیم حاصل کر کے مذہب اور اپنی روایتوں اور قدروں سے بیگانہ اور بے حس ہو جائیں گے اور ان کا مذہبی اور تہذیبی سرمایہ ختم ہو جائے گا۔ چند اشعار دیکھئے:

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب تلک بیگانہ تھی
اب ہے شمع محفل ، پہلے چراغ خانہ تھی

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبرؔ زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

ہو کے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا

ایسے متعدد اشعار اکبر کے کلام میں موجود ہیں جو جدید طرز تعلیم، مغربی تہذیب وتمدن اور سرسید کے افکار وخیالات کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ ان اشعار سے اکبر کے نقطۂ نظر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تاہم اکبر اپنے عہد کی تہذیبی کشمکش اور مشرقی اقدار اور روایات پر مغرب کے منفی اثرات کو اپنی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں جرأت مندی، بے باکی اور دردمندی وخلوص کے ساتھ موضوع بحث بناتے ہیں۔

اکبر کی زبان سادہ اور سلیس ہے اور انھوں نے اپنے کمال فن سے انگریزی الفاظ کا برجستہ استعمال اپنے اشعار میں کیا ہے جو ان کے طنزیہ اور مزاحیہ کلام کی شدت اور حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی یقیناً طنزیہ ومزاحیہ شاعر کی حیثیت سے اردو شاعری میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

9.4۔ اکبر الٰہ آبادی کی نظم 'مستقبل'

9.4.1 متن

مستقبل

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے — نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی — نہ ایسا پیچ زلفوں میں، نہ گیسو میں یہ خم ہوگے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردے کی پابندی — نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے
بدل جائے گا انداز طبائع دور گردوں سے — نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسباب غم ہوں گے
خبر دیتی ہے تحریک ہوا، تبدیل موسم کی — کھلیں گے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملّت سے — نیا کعبہ بنے گا، مغربی پتلے صنم ہوں گے
بہت ہوں گے مغنی نغمۂ تقلید یورپ کے — مگر بے جوڑ ہوں گے، اس لیے بے تال وسم ہوں گے
ہمارے اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی — لغات مغربی بازار کی بھاشا سے ضم ہوں گے
بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں — زیادہ تھے جو اپنے زعم میں، وہ سب سے کم ہوں گے
گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے — کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ وحشم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا، نہ غم ہوگا — ہوے جس ساز سے پیدا، اسی کے زیر و بم ہوں گے

تمھیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے، اکبر؟
بہت نزدیک ہے وہ دن، نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

9.4.2 تشریح

اکبر الٰہ آبادی نے اس نظم میں مشرقی اقدار اور روایات سے نئی نسل کی بے حسی اور مستقبل میں سماج اور معاشرے میں اس کے اثرات کو موضوع بحث بنایا ہے اور نئے دور میں مشرقی تہذیب وتمدن کے خاتمے پر اظہار افسوس کیا ہے ۔ ۲۴ مصرعوں (۱۲ اشعار) کی یہ نظم غزل مسلسل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔

پہلے شعر میں اکبر کہتے ہیں کہ موجودہ طریقے یعنی مشرقی (اسلامی) تہذیب وثقافت، جدید طرز تعلیم کی وجہ سے ختم ہو جائے گی اوراس کی جگہ نئی تہذیب یعنی مغربی اقدار اور روایات لے لیں گی۔

دوسرے شعر میں شاعر نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نئی تہذیب اب اپنے جلوے اور کرشمے دکھائے گی۔ مشرقی روایتیں اور قدریں دھیرے دھیرے عوام کے ذہن سے محو ہو جائیں گی۔ تیسرے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ نئی تہذیب کے آمد سے عورتیں پردہ اور حجاب بھول کر پوری طرح مغربی انداز میں نظر آئیں گی۔ چوتھے شعر میں اکبر کہتے ہیں کہ نئے زمانے کی روش سے سماج اور معاشرے میں

تبدیلیاں پیدا ہوں گی اور اب خوشیاں اور غم منانے کے بھی نئے طریقے ایجاد کیے جائیں گے۔

اکبر پانچویں شعر میں سماجی اور تہذیبی تغیرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب نیا دور آنے والا ہے جس میں نئی قدریں اور نئے ساز وسامان ہونگے۔ مشرقی روایتوں اور قدروں کی اہمیت باقی نہیں بچے گی۔

چھٹے شعر میں اکبر فرماتے ہیں کہ جدید طرز تعلیم سے مذہبی عقیدے کو چوٹ پہنچے گی اور اب عبادت کے طور طریقے بھی بدل جائیں گے۔ ساتویں شعر میں شاعر کہتا ہے کہ عصر نو میں یوروپی تہذیب کی تقلید کی پیروی اور اس کی خوبیاں بیان کرنے والے بہت لوگ ہونگے لیکن اپنی قدروں اور روایتوں سے سروکار نہیں رکھنے کی وجہ سے ان میں کوئی تال میل نہیں ہوگا۔

آٹھویں شعر میں اکبر فرماتے ہیں کہ آنے والے دور میں نئی نسل ہماری اصطلاحوں کو بھی بھول جائے گی اور ہمارے لغات میں مغربی زبان کے الفاظ کی بھر مار ہوگی۔

نویں شعر میں شاعر نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ مغربی تہذیب کے اثرات سے دنیا میں عزت وشرافت کا معیار بدل جائے گا۔ جو لوگ مشرقی اقدار وروایات کی پیروی کریں گے انھیں غیر مہذب سمجھا جائے گا۔

دسویں شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اب اسلامی تہذیب وتمدن کے شاندار کارناموں کا بھی کوئی نام لینے والا نہ ہوگا اور ہماری شان وشوکت کی داستانیں کتابوں تک محدود ہوکر رہ جائیں گی۔

گیارہویں شعر میں اکبر کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب کی تقلید کی دھُن میں نئی نسل کو مشرقی اقدار وروایات کے خاتمے کا نہ کوئی حس ہوگا نہ غم۔ نئی نسل پوری طرح سے مغربی آداب واطوار کے زیر اثر ہوگی۔

بارہویں شعر میں اکبر نے اپنے تخلص کا استعمال کیا ہے، کہتے ہیں کہ اس تغیر اور انقلاب کا تمہیں کیوں غم ہے کیوں کہ وہ دن بہت جلد آنے والا ہے جب اس دنیا میں نہ ہم ہونگے نہ تم ہوگے۔ یہ نظم مغربی تہذیب وتمدن کے متعلق اکبر الہ آبادی کے افکار وخیالات کی ترجمان ہے۔

9.4.3 تجزیہ

'مستقبل' اکبر الہ آبادی کی ایک اہم نظم ہے جس میں مشرقی اور مغربی تہذیب ومعاشرت کی کشمکش، تصادم اور مشرقی اقدار وروایات پر مغربی تہذیب ومعاشرت اور طرز تعلیم کو اثر انداز ہوتے دکھایا گیا ہے۔

1857ء کے بعد ہندوستان کی سماجی اور معاشرتی زندگی میں ہونے والی تبدیلیاں نئی نسل کو عصری علوم وفنون کی جانب مائل کر رہی تھی۔ اس عہد میں ہندوستانی نوجوان انگریزی اور سائنس وٹیکنالوجی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب ومعاشرت سے متاثر ہونے لگے تھے۔

سر سید احمد خاں کی اصلاحی تحریک کے زیر اثر مسلم نوجوان بھی جدید طرز تعلیم کی طرف راغب ہو رہے تھے اور عصری تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن اکبرالہ آبادی جدید طرز تعلیم اور مغربی تہذیب و معاشرت کے سخت مخالف تھے اور اپنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے ذریعے جدید تعلیم اور تہذیب کی خامیوں کو اجاگر کرتے تھے۔

نظم 'مستقبل' میں اکبرالہ آبادی نے مشرقی تہذیب وتمدن سے نئی نسل کی بے گانگی، بے حسی اور ہندوستانی معاشرے میں مغربی تہذیب کے پیر جمانے اور آنے والے دور میں اس کے بُرے اثرات کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ وہ اس نظم میں بتانا چاہتے ہیں کہ مغربی تہذیب و معاشرت اور جدید طرز تعلیم کی وجہ سے بہت جلد مشرقی روایتیں اور قدریں دم توڑ دیں گی اور ایک نامانوس اور نئی تہذیب اس کی جگہ لے لے گی اور ہماری مذہبی اور تہذیبی شناخت ختم ہو جائے گی۔ بقول اکبر:

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشا اللہ

مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

اکبر نے اس نظم میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عصری حالات و مسائل زمانے میں تبدیلیوں کے باعث ہونگے۔ عورتیں پردے کی پابندی سے آزاد ہوں گی۔ نئے طور طریقے معاشرے میں راہ پائیں گے۔ مغربی طرز فکر مذہبی عقائد کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوگی۔ آنے والے دور میں یوروپ کی تقلید کی حمایت کرنے والے بھی بہت ہونگے اور نئی نسل مشرق کی اصطلاحات اور اپنے آباواجداد کے شاندار کارناموں سے بھی ناواقف ہوگی اور یہ سب کچھ کتابوں میں محدود ہو کر رہ جائے گا۔ نئی نسل کو نہ ان تبدیلیوں کا احساس ہوگا اور نہ غم بلکہ وہ نئی تہذیب کی پروردہ ہوگی اور اسی کے زیر اثر رہے گی۔

اکبر نے اس نظم میں اپنے عہد کی تہذیبی کشمکش اور آنے والے دور میں مشرقی اقدار و روایات اور مذہبی و تہذیبی انفرادیت کے گم ہو جانے کا خدشہ ظاہر کیا ہے۔ اکبرالہ آبادی کو مشرقی اقدار وروایات سے بے حد لگاؤ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں ان کی سنجیدگی، شائستگی، خلوص اور دردمندی پوری طرح موجود ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں مغربی تہذیب کے زیر اثر مستقبل کے ہندوستانی سماج اور معاشرت کی تصویر کشی کی ہے۔ اکبر اپنے طنز و مزاح کے ذریعے زندگی کی تنقید اور اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔

9.5 خلاصہ

اکبرالہ آبادی کا پورا نام سید اکبر حسین رضوی اور اکبر تخلص تھا۔ وہ 16 نومبر 1846ء کو بارہ، ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید تفضّل حسین تھا۔

بچپن میں گھر پر تعلیم حاصل کرنے کے بعد اکبر اسکول میں داخل ہوئے۔ مطالعے کا شوق تھا اور ذہین بھی تھے۔ انگریزی حکومت میں نوکری بھی کی اور سیشن جج کے عہدے تک پہنچے۔ 9 ستمبر 1921ء کو الہ آباد میں اکبر کا انتقال ہوا اور یہیں دفن کیے گئے۔

اکبر نے شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا لیکن انھیں شہرت طنزیہ و مزاحیہ نظم نگاری کی بدولت ملی۔ انھوں نے اردو نظم کو ایک نئے اسلوب سے روشناس کرایا۔

اکبر کا عہد سماجی اور سیاسی تبدیلیوں سے عبارت تھا۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کا راج تھا اس زمانے میں اصلاحی تحریکیں زوروں پر تھیں، ہر طرف جدید طرز تعلیم اور عصر نو میں اس کی اہمیت اور افادیت کی گونج سنائی دیتی تھی۔ لیکن اکبر جدید

طرز تعلیم اور مغربی تہذیب وتمدن کو ہندوستانی سماج بالخصوص مسلمانوں کے لیے سودمند نہیں سمجھتے تھے۔سماجی اور معاشرتی اصلاح اور ترقی کے نام پر مذہب اور تہذیب وثقافت سے بے حسی اور بے گانگی انھیں گوارہ نہیں تھی۔ وہ اپنی شاعری میں انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کی خامیوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔انکی شاعری کا مقصد محض ہنسی مزاق نہیں بلکہ اس میں سنجیدگی، خلوص اور دردمندی کے ساتھ زندگی کی تنقید اور اصلاح کی کوشش ہے۔ اکبر اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے اپنے عہد کی تہذیبی کشمکش اور حالات ومسائل کو طنزیہ اور مزاحیہ لہجے میں فن کارانہ ہنرمندی سے پیش کرتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی کی زبان رواں دواں، سادہ اور سلیس ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عام بول چال کی زبان اور انگریزی الفاظ کا استعمال فنکارانہ چابک دستی سے کیا ہے اور وہ اپنے مخصوص افکار وخیالات اور اسلوب کی بنا پر اردو نظم گوئی میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔

9.6 نمونۂ امتحانی سوالات

۱- اکبر الہ آبادی کی حیات پر روشنی ڈالیے؟

۲- اکبر الہ آبادی کی نظم گوئی پر اظہار خیال کیجیے؟

۳- اکبر الہ آبادی کی نظم 'مستقبل' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے؟

9.7 فرہنگ

الفاظ	معنی
بربریت	وحشی پن، خونخواری
اقدار	قدر کی جمع، قدریں
کوشاں	کوشش کرنے والا
بانی	بنیاد رکھنے والا، موجد
منصف	انصاف کرنے والا، عدالت کا عہدے دار
بنیادگزار	بنیاد رکھنے والا
دوام	ہمیشگی، ہمیشہ رہنے والا
تقلید	پیروی، نقل
سودمند	فائدہ مند، مفید
طرزفکر	سوچنے کا طریقہ
روشناس	جان پہچان والا، واقف کار
زیرکرنا	فتح کرنا، پچھاڑنا
تصادم	باہم ٹکرانا

کشمکش	کھینچا تانی، لڑائی جھگڑا
مضر	نقصان پہنچانے والا، ضرر پہنچانے والا
ہدف	نشانہ
مستحکم	پکا، مضبوط
متعدد	بہت، کئی
مضحکہ	ہنسی، مذاق
خدشہ	ڈر
راہی ملک عدم	عدم کی راہ پر چلنے والا، ختم ہو جانے والا، دنیا سے دور جانے والا
طبائع	طبیعت کی جمع
دور گردوں	زمانے کی تبدیلی، زمانے کا تغیر
عقائد	عقیدہ کی جمع
اسباب	سبب کی جمع، وجہ
ترمیم	بدلنا، کم یا زیادہ کرنا
مغنی	گانے والا
تقلید	پیروی
نا آشنا	ناواقف
ضم	مل جانا، گھل جانا
زعم	غرور، گھمنڈ
جاہ وحشم	شان وشوکت
تغیر	تبدیلی
دہر	دنیا، وقت، زمانہ
زیروبم	موسیقی کی اصطلاح، نیچے اوپر
لغات	لغت کی جمع، الفاظ

9.8 سفارش کردہ کتابیں

اکبرنامہ — عبدالماجد دریابادی

انتخاب اکبرالہ آبادی — صدیق الرحمٰن قدوائی

اکبرالہ آبادی: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ — خواجہ محمد زکریا

جدید اردو نظم، نظریہ وعمل — عقیل احمد صدیقی

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ — احتشام حسین

بلاک۔۴ کا تعارف:

یہ بلاک بھی چار اکائیوں پر مشتمل ہے۔اس بلاک میں دسویں اکائی سے لے کر بارہویں اکائی تک کا مواد شامل ہے۔ دسویں اکائی 'چکبست اوران کی نظم آوازہ قوم' کوموضوع بنایا گیا ہے۔چکبست کا دور ہندوستانی سیاسی وسماجی بیداری کا یہی زمانہ تھا۔چکبست اس سیاسی بیداری کی تحریک کے پوری طرح سے ہم نوا تھے۔وہ ایک سچے وطن پرست کی طرح یہی پیغام اپنی شاعری سے دیتے رہے کہ ہم کو وطن سے محبت ہو اور وطن کے رہنماؤں سے بھی پیار ہو۔

گیارہویں اکائی 'علامہ اقبال اوران کی نظم شعاع امید' پر مشتمل ہے۔ہماری شعری روایت میں اقبال کا اردو کلام ایک حیرت انگیز اضافہ ہے۔وہ ہمارے جذبات اور محسوسات کا ایک ایسا مرکب ہے جس میں ان گنت پہلو شامل ہیں۔اقبال بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔انھیں بیانیہ پر قدرت حاصل ہے۔انھوں نے روایت سے ہٹ کر غزل کو نیا امتیاز اور رنگ وآہنگ دیا۔

بارہویں اکائی 'جوش ملیح آبادی اوران کی نظم البیلی صبح' کو محیط ہے۔جوش انقلابی شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے بدلتے ہوئے سماجی حالات ان کی شاعری کے موضوع ہیں۔

اکائی 10 چکبست ۔۔۔آوازۂ قوم

ساخت

10.1 اغراض ومقاصد
10.2 تمہید
10.3 چکبست کے سوانحی حالات
10.4 متن: آوازۂ قوم
10.5 نظم آوازۂ قوم کی تشریح
10.6 فرہنگ
10.7 اپنی معلومات کی جانچ کیجیے
10.8 نمونہ امتحانی سوالات
10.9 سفارش کردہ کتابیں

10.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

☆چکبت کی حیات اورشاعری پراظہارخیال کرسکیں گے۔

☆نظم کی تشریح کرسکیں گے۔

☆نظم کی تفہیم وتحسین کرسکیں گے۔

☆نظم کا خلاصہ اورمرکزی خیال بیان کرسکیں گے۔

☆چکبست کی شاعری کے اسلوب سے واقف ہوں گے۔

10.2 تمہید

پنڈت برج نارائن چکبست ۱۹رجنوری ۱۸۸۲ءکوفیض آباد میں پیدا ہوئے۔چکبست کے سن بلوغ کا زمانہ انیسویں صدی کے اختتام اوربیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ ہے۔اس زمانہ میں ملک میں سیاسی سرگرمیاں بہت تیز ہوگئی تھیں۔کانگریس اس وقت تک ملک کی واحد سیاسی پارٹی تھی جس میں گوکھلے، دادا بھائی نوروجی، بپن چندر پال جیسےلوگ بھی شامل ہو چکے تھے جولبرل ازم کے ساتھ اپنے لہجے میں بغاوت کی جھنکار بھی رکھتے تھے۔چکبست کا دور ہندوستانی سیاسی وسماجی بیداری کا یہی زمانہ تھا۔ چکبست اس سیاسی بیداری کی تحریک کے پوری طرح سے ہم نوا تھے۔وہ ایک سچے وطن پرست کی طرح یہی پیغام اپنی شاعری سے دیتے رہے کہ ہم کووطن سے محبت ہواوروطن کے رہنماؤں سے بھی پیارہو۔

10.3 چکبست کے سوانحی حالات

پنڈت برج نارائن چکبست ۱۹؍جنوری ۱۸۸۲ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے مگر پانچ چھ سال کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد ماں کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے تو یہیں کے ہو رہے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے، ایل ایل بی کی ڈگری لی، وکالت شروع کی اور اچھے وکیلوں میں رہے مگر وکالت سے زیادہ ان کی دلچسپی شاعری سے رہی۔ وہ اپنے وقت کے با اثر نامور شاعروں میں شمار ہوئے۔ وہ ایک بیدار مغز شاعر تھے اسی سبب ان کی شاعری کو قومی و وطنی ترانہ کہا جاتا ہے کہ اس میں اپنے عہد کی سماجی و سیاسی بیداری کی تصویریں ہیں۔ ان کا ۱۲؍فروری ۱۹۲۶ء کو رائے بریلی میں انتقال ہوا۔

چکبست کے سن بلوغ کا زمانہ انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں ملک میں سیاسی سرگرمیاں بہت تیز ہوگئی تھیں۔ کانگریس اس وقت تک ملک کی واحد سیاسی پارٹی تھی جس میں گوکھلے، دادا بھائی نوروجی، بپن چندر پال جیسے لوگ بھی شامل ہو چکے تھے جو لبرل ازم کے ساتھ اپنے لہجے میں بغاوت کی جھنکار بھی رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے انگریز سرکار سے 'حکومت خود اختیاری' یعنی Home Rule کی مانگ کر لی تھی۔ 'ہوم رول' یعنی ہندوستانیوں کو بھی حکومت میں ساجھے داری ملے۔ انگریز حاکم بنے رہیں لیکن ملک کے اندرونی معاملات میں حکومت کرنے کے لیے ہندوستانیوں کو اقتدار دیا جائے۔ دھیرے دھیرے اس تحریک نے بڑا زور پکڑ لیا تھا۔ ۱۹۰۵ء تک آتے آتے کانگریس نے اپنی آزادی کی لڑائی کو بہت تیز کر دیا تھا اور پورے ملک میں ''سودیشی'' تحریک چلا دی تھی۔ انگریز سرکار نے اس کو دبانے کے لیے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا جیسی پارٹیاں بنوا دیں کہ اس تحریک میں رخنہ ڈال سکے مگر سودیشی تحریک جنگل کی آگ کی طرح تیز ہوتی گئی۔ ۱۹۰۶ء میں پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ ہوتو انگریز سرکار سہم گئی۔ اس نے ۱۸؍جولائی ۱۹۱۸ء کو مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ پیش کی تو بڑا واویلا مچا اور کانگریس پارٹی بھی دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ 'ہوم رول' کی تحریک نے اور زور پکڑا ۱۹۱۶ء میں مسز اینی بیسنٹ نے ''آل انڈیا ہوم لیگ'' قائم کی اور بال گنگا دھر تلک کے ساتھ مل کر اس تحریک کو بہت ترقی دی۔

۱۹۱۹ء (۸؍مارچ) کو رولٹ ایکٹ پاس ہوا تو اس نے اور ہنگامہ مچا دیا۔ اس ایکٹ کے ذریعہ سرکار کسی آدمی کو پکڑ کر مقدمہ چلانے کا حق ملا تھا۔ اس کی زبردست مخالفت ہوئی۔ بڑے پیمانے پر سزائیں ہوئیں ملک کے تمام بڑے لیڈروں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا اور تاریخی ملک گیر ہڑتال ہوئی۔ ۱۳؍اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیان والا باغ کا غم انگیز سانحہ ہوا۔ جنرل ڈائر نے ۲۰ ہزار تاریخی لوگوں کو گولی کا نشانہ بنایا۔ ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نے ''تحریک ترک موالات'' شروع کی اور 'عدم تعاون کی تحریک'' نے اور زور پکڑا۔ سارے ملک میں ہر طرف ہڑتالیں ہی ہڑتالیں ہونے لگیں اور قریب ۳۰ ہزار لوگ جیلوں میں بھر دیئے گئے۔ ۷؍نومبر ۱۹۲۱ء کو پرنس آف ویلز کا استقبال بمبئی میں ہڑتال سے کیا گیا۔ گولیاں بھی چلیں، سیکڑوں لوگ مارے گئے۔ پورے ملک میں تحریک آزادی اور گاندھی جی کی قیادت نے زور پکڑا۔

چکبست کا دور ہندوستانی سیاسی و سماجی بیداری کا یہی زمانہ تھا۔ چکبست اس سیاسی بیداری کی تحریک کے پوری طرح سے ہم نوا تھے۔ وہ ایک سچے وطن پرست کی طرح یہی پیغام اپنی شاعری سے دیتے رہے کہ ہم کو وطن سے محبت ہو اور وطن کے رہنماؤں سے بھی پیار ہو وہ کہتے ہیں:

ہمارے واسطے زنجیر طوق گہنا ہے
وفا کے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے
سمجھ لیا کہ ہمیں رنج و درد سہنا ہے
مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

10.4 متن: آوازۂ قوم

یہ خاک ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار ہمالیہ سے اٹھے جیسے ابر دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار ہوئی ہیں خاک کے پردے میں ہڈیاں بیدار
زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے
نگاہِ شوق ہے اس رنگ کی تماشائی ہے جس سے شیخ و برہمن پہ بے خودی چھائی
ہر ایک گام پہ کرتے ہوئے جبیں سائی چلے ہیں بہت زیارت وفا کے سودائی
وطن کے عشق کا بہت بے نقاب نکلا ہے
نئے افق سے نیا آفتاب نکلا ہے
یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گلچیں نہ صبح و شام رہے نہ کوئی مرغ خوش الحان اسیر دام رہے
سریر شاہ کا اقبال ہو بہار چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاج دار چمن
ہے آج کل کی ہوا میں وفا کی بربادی سنے جو کوئی تو سارا چمن ہے فریادی
قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی اڑے ہے باغ سے بو ہو کے رنگ آزادی
ہوا سے شوق سے بیچے بکس نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو نہیں نہیں سکتے
جو آج حق ہے محبت وطن کی عالمگیر یہی گنہ ہے یہی جرم ہے یہی تقصیر
زباں ہے بند قلم کو پنہائی ہے زنجیر بیان درد کی باقی نہیں کوئی تدبیر
ہے دل میں درد مگر طاقت کلام نہیں
لگے ہیں زخم تڑپنے کا انتظام نہیں
جو اپنے حال پہ یہ بے کسی برستی ہے یہ نائبان حکومت کی خودپرستی ہے
یہاں سے دور جو برطانیہ کی بستی ہے وہاں، سنا ہے محبت کی جنس سستی ہے
جو اس پہ حال وطن آشکار ہو جائے
یہ دیکھتے رہیں، بیڑا یہ پار ہو جائے
فدائیان حکومت نے ہم کو رنج دیئے مگر جو فرض وفا تھے، ادا وہ ہم نے کئے
نثار جاں سے ہوئے داب سلطنت کے لئے شراب پیش سمجھ کر لہو کے گھونٹ پیئے

ڈگے نہ پاؤں محبت کے نوک خنجر پر
لہو کی مہر ہے اپنی وفا کے محضر پر
جو اپنے دل سے ہے برطانیہ کا دل راضی   تو کیا کریں گے یہ ہندوستان کے قاضی
نہ کام آئے گی غیروں کی رخنہ اندازی   تمھیں پکار رہی ہے سخی کی فیاضی
بچی کھچی یہ قناعت ہے یوں نہیں پیتے
پلانے والا پلاتا ہے کیوں نہیں پیتے
رہا ہے رات کی صحبت میں کیا مزا باقی   نگاہ شوق کو ہے دور نو کی مشتاقی
نئی شراب، نیا دور اور نیا ساقی   مٹے سرور میں دیر و حرم کی ناچاقی
یہی کسی کا حرم ہو کسی کا دیر رہے
یہ میکدہ رہے آباد خم کی خیر رہے
شراب شوق دوا ہے اس انجمن کے لئے   سرور اس کا ہے اکسیر روح تن کے لئے
کھنچی ہے خلد میں اس محفل کہن کے لئے   فلک سے اتری ہے یہ شیخ و برہمن کے لئے
رہے گا دور زمانے میں یادگار اس کا
یہ ہوم رول کا سودا خمار ہے اس کا
اسی کے مست کہیں ہیں حرم پہ چھائے ہوئے   اذاں کے نعرۂ دلکش کے حظ اٹھائے ہوئے
جدھر نگاہ اٹھے اس طرف نیا ہے سماں   اسی فضا میں یہ سب راگ ہیں سمائے ہوئے
یہ حکم پیر مغاں کا ہے نشہ مے میں
یہ راگ آ کے ملیں ہوم رول کی لے میں
رقیب کہتے ہیں رنگ وطن نہیں یکساں   بنا ہے قوس قزح خاک ہند کا داماں
جدھر نگاہ اٹھے اس طرف نیا ہے سماں   نہ ایک رنگ طبیعت نہ ایک رنگ زباں
جو ہوم رول پہ یہ چشم شوق شیدا ہو
تمام رنگ میں ایک نور پیدا ہو
جو سے قوم کے نکلی ہے وہ صدا ہے یہی   تھا جس پہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہے یہی
دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ہوا ہے یہی   غریب ہند کے آزار کی دوا ہے یہی
نہ چین آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے
فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لو لگائے ہوئے
یہ جوش پاک زمانہ دبا نہیں سکتا   رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا   دلوں میں آ کے یہ ارمان جا نہیں سکتا
طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

10.5 نظم آوازۂ قوم کی تشریح

نظم ''آوازۂ قوم'' بیسویں صدی کے ربع اول کے ممتاز شاعر پنڈت برج نارائن چکبست کی اہم اور مشہور نظموں میں سے ایک ہے۔ چکبست اپنے دور کے سیاسی وسماجی حالات سے باخبر شعراء میں ہیں۔ خاص طور سے اس وقت کی قومی تحریکوں اور آزادی کی جدو جہد ہندو مسلم اتحاد اور وطن پرستی کے احساسات کو شعری پیکر میں ڈھالنے میں کمال کی مہارت رکھتے تھے۔ نظم آوازۂ قوم ان کی سیاسی سوجھ بوجھ کا بہترین نمونہ ہے۔ قومی و دینی جذبہ سے سرشار ہے جس میں وطن سے محبت کا جذبہ بھی ہے اور ساتھ ہی وطن سے محبت کرنے والوں سے بھی محبت کی تلقین ہے۔ ان کی ایسی نظموں میں مرثیہ گوکھلے، مرثیہ تلک اور خاک ہند وغیرا اہم ہیں۔

پہلا بند: علم کا آغاز شاعر اپنے وقت کی سیاسی جدو جہد اور ملک کی آزادی کی لڑائی سے پورے دیش میں پھیل چکی تھی اس کے اثرات کے جذبہ سے متاثر ہو کر شاعر کہتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کی دھرتی سے جوش کے آثار پیدا ہیں۔ ہندوستان کا ذرہ ملک کی آزادی کی لڑائی میں شامل ہے۔ اس لیے اس میں اتنا زور ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جسے ہمالیہ پہاڑے ایسے بادل اٹھ رہے ہوں جو دریا کو بھر دیں گے۔ اسی طرح ہر ہندوستانی کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون بجلی کی رفتار کی طرح دوڑ رہا ہے۔ آج آزادی کی مانگ کرنے میں ہماری سوکھی ہڈیاں جو ایک طرح سے مردہ ہو کر خاک کے نیچے دبی ہوئی تھیں وہ سب بیدار ہو گئی ہیں یعنی سویا ہوا ہندوستان جاگ گیا ہے۔ اب اسے انگریز سرکار سے آزادی حاصل کرنے میں کوئی روک نہیں سکتا۔ زمین سے آسمان تک شور ہے کہ ہم کو 'ہوم رول' چاہیے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے پوری ہندوستانی قوم کا شباب یعنی جوانوں کی طاقت لگی ہوئی ہے اور یہ صرف اس لیے ہے کہ سارا زور اس پر ہے کہ ہم ہندوستانیوں کو 'اپنے ملک کے اندرونی معاملات میں حکومت کرنے کا حق ملنا چاہیے اور ہم کو اس کو لے کر رہیں گے۔

دوسرے بند میں شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ ہر دیکھنے والی نگاہ اس جشن جدو جہد آزادی کی تماشائی ہے۔ اس میں ملک کا ہر فرد شامل ہے وہ چاہے ہندو ہو یا مسلم سب پر یہ بے خودی چھائی ہوئی ہے کہ ہم 'ہوم رول' لے کر رہیں گے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہم قدم قدم پر اپنے ماتھوں کو ٹیکتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں گے۔ اپنے محبوب رہنماؤں کے ساتھ وہ چاہے گوکھلے ہوں یا تلک یا مسز اینی بیسنٹ ہم ان سب کے ساتھ اپنے نصب العین یا اپنے مقصد یعنی 'ہوم رول' کو حاصل کرنے کے لیے اس کی زیارت کرنے یعنی اس کو دیکھنے نکلتے ہیں۔ ہم مادر وطن کو آزاد کرانے کے عاشق ہیں اس لیے کسی طرح کی پردہ داری نہیں۔ صاف اظہار ہے کہ ہم کو 'ہوم رول' چاہیے۔ نئے افق یعنی بدلے ہوئے حالت کے نئے منظر نامے سے ہماری تمناؤں کا نیا سورج نکلا ہے۔

تیسرے بند میں شاعر کہتا ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ملک میں ایسا انتظام رہے کہ ملک والوں کے ساتھ مہربانی اور پیار و محبت سے کام لیا جائے اور ایسے حالات کا بننا تب ممکن ہوگا جب اپنے باغ میں یعنی اپنے وطن میں اپنا انتظام رہے۔ انگریزوں کا نہ رہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم 'ہوم رول' حاصل کر لیں۔ اپنا انتظام ہونے سے ہم آرام و چین سے رہ سکیں گے۔ یہاں کا موجودہ حکمراں جو صبح و شام ہمارے پھولوں کو توڑنے کی فکر میں رہتا ہے یعنی ہمارے ملک کے اچھے لوگوں کو برباد کرنے کی فکر میں رہتا ہے، ڈر نہ رہ جائے اور اگر کوئی ہمارا اچھا لیڈر ہمارے لیے اچھی بات کرتا ہے تو وہ جیلوں میں مقید کر دیا جاتا ہے، اس کا ڈر بھی

ختم ہو جائے۔ ہم یہ نہیں مانگ کرتے کہ انگریز حکمراں یہاں سے چلے جائیں وہ ملک کے نگراں اور حاکم بنے رہیں۔ ہم ہندوستانیوں کو ملکی انتظامات میں پوری آزادی کے ساتھ حکومت کرنے کا حق دے دیں اور حاکم بنے رہیں۔ یہی 'ہوم رول' کا مطلب تھا اور یہی اس وقت کی آزادی کی لڑائی کی مانگ تھی جو بہت عام تھی۔

چوتھے بند میں شاعر کہہ رہا ہے کہ آج کل ملک و وطن کی محبت میں لڑائی کرنے والوں کی بربادی انگریز سرکار کر رہی ہے۔ اگر اس کو کوئی ایمانداری سے سنے تو اس کو اندازہ ہوگا کہ صرف ہمارے نیتا ہی مانگ نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان کے ساتھ پورا ملک ہے۔ ان ملک والوں کو آزادی دلانے کے لیے لڑائی کرنے والوں کو جیلوں میں بند کر کے رکھ دیا گیا ہے اور ان کی ساری آزادی ختم کر دی گئی ہے اور ایسا ماحول انگریز سرکار نے بنا رکھا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ اس ملک سے آزادی خوشبو بن کر اڑ گئی ہے۔ اور انگریز حکومت نے جو اتنی سختی اور اتنی ظلم و زیادتی کر رکھی ہے کہ کوئی کی بھی آزادی کی تمنا رکھنے، لڑائی کرنے کے لیے کھل نہیں سکتی اور کلی تو کلی اس باغ کے پھول بھی ہنس نہیں سکتے۔ یعنی 'ہوم رول' کی مانگ کی لڑائی کرنے والے نوجوان، جوان اور بوڑھے سب نظر بند کر دیئے گئے ہیں کہ وہ اپنے مطالبات کے لیے آواز نہیں اٹھا سکے۔

پانچویں بند میں سیاسی جدو جہد کا مکمل اشارہ ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریک پورے شباب پر آ گئی تھی اور گاندھی جی ملک و قوم کے چہیتے رہنما کے طور پر لوگوں کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے اور ان کی سرکردگی میں پورا ملک ایک آواز ہو کر وطن کی محبت کا راگ الاپ رہا تھا اور گاندھی جی کے بتائے ہوئے راستے پر یعنی عدم تعاون پر چل پڑا تھا۔ مگر عدم تشدد کے ساتھ اور اس اقدام میں ملک کے نامور رہنما اور لیڈر انگریز سرکار کے حکم سے پکڑے جا رہے تھے، جیلوں میں بند کئے جا رہے تھے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارا جرم، ہمارا گناہ اور ہمارا قصور صرف اتنا تھا کہ ہم مادر وطن کی محبت میں اس کو انگریزوں کی غلامی اور ذلت سے آزاد کرانے کے لیے عدم تشدد کے ساتھ یہ سب کر رہے تھے۔ یہی نہیں ہمارے رہنماؤں کی تقریر اور تحریر پر بھی انگریز سرکار تالے لگا رہی تھی۔ ملک کی محبت میں کچھ کہنا یا لکھنا بھی جرم قرار دیا جا رہا تھا۔ انگریز سرکار نے ایسی ازبردست ناکہ بندی کر رکھی تھی کہ ہندی کر رکھی تھی کہ ہم اپنے درد کو بھی بیان ہیں کر سکتے تھے۔ وہ بھی جرم قرار دیا جا رہا تھا۔ چکبست اس بند میں اس موقع کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جب ۱۹۲۱ء میں احمد آباد کے کانگریس کے اجلاس میں پارٹی نے گاندھی جی کی قیادت میں لڑائی کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کر دیا تھا اور گاندھی جی کی سربراہی میں پورا ملک پوری طاقت کے ساتھ چل پڑا تھا اور چوراچوری کا واقعہ پیش آیا اور انگریز سرکار بڑے ظلم و زیادتی سے پیش آئی، سارے بڑے لیڈر پکڑ کر جیلوں میں بند کر دیئے گئے تھے اور سرکار کی سختی اور زیادتی سے ڈر کی وجہ سے کوئی بولنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا حالانکہ ہر ہندوستانی کے دل میں اپنے رہنماؤں کے لیے بڑا درد اور ہمدردی تھی۔ اسی لیے شاعر کہتا ہے کہ آج یہ حالت بنا دی گئی ہے کہ ہمارے زخم کھلے ہیں مگر تڑپنے کی اجازت نہیں ہے اور ہم تڑپتے ہیں تو سرکار کے ظلم و جور کا نشانہ بنتے ہیں۔

اگلے بند میں شاعر اپنے لہجہ میں ایک نیا موڑ لاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سارا ظلم و ستم کا انتظام ہندوستان میں موجود انگریز حاکموں کا ہے۔ سرکار انگلشیہ جو لندن میں ہے وہ ایسی ظالم اور ستم گر نہیں ہے ان کے اندر ہمارے لیے رحم ہے مگر ہندوستانی کار پرداز جو نائبان حکومت ہیں، وہ ظلم و زیادتی کرتے ہیں اور یہاں کا صحیح حال سرکار برطانیہ و لندن میں ہے اس کو بتاتے بھی نہیں اگر اس کو ہمارے ملک کی سچی تصویریں دکھائیں اور اس پر ہمارا حال ظاہر ہو جائے تو وہ ہمیں ضرور آزادی دے دے اور یہ سب دیکھتے رہ جائیں مگر اس تک ہماری پہنچ نہیں ہو پا رہی ہے۔

ساتویں بند میں بھی شاعر وہی بات کہہ رہا ہے کہ یہاں پر جو برٹش سرکار کے کار پرداز موجود ہیں اپنی حکومت چلانے اور

حاکم بنے رہنے کی لالچ میں انھوں نے یہ ساری تکلیف و پریشانیاں ہمیں دے رکھی ہیں مگر اس کے باوجود ہم ہر ظلم وستم کو برداشت کرتے ہوئے مادر وطن کو آزاد کرانے کے لیے جو ہماری ذمہ داریاں تھیں ان کو بڑی ہمت سے پورا کر رہے ہیں اور جان کی بازی تک لگا دی ہے اور ایسا کرنے میں ہمیں جو خون کے گھونٹ پینے پڑے ہیں ان کو ہم ہندوستانیوں نے شراب عیش سمجھ کر پیا ہے۔ مگر آزادی کی لڑائی لڑنے میں ہمارے پاؤں ڈگمگائے نہیں۔ ہم بڑی مضبوطی اور ہمت سے آگے بڑھتے رہے۔ سرکار نے لاکھ خنجر کی نوک سے ہمیں ڈرانا چاہا، مگر ہم ڈرے نہیں، ہم نے اپنی وفا کی چادر پر اپنے خون سے مہر لگائی ہے یعنی ہم ہندوستانیوں نے آزادی کی لڑائی میں اپنی جانیں تک نثار کی ہیں اور اپنا خون دے کر وطن کی محبت کی چادر پر اس سے مہر لگائی ہے اور ہماری اس لڑائی کو برطانیہ سرکار درست سمجھتی ہے بس اس تک آواز پہنچانے کی ضرورت ہے۔

آٹھویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ ہم ہندوستانیوں کے دل کی بات کو برطانیہ سرکار دل سے سننے کو راضی ہے۔ شاعر ۱۹۲۰ء کی پہلی گول میز کانفرنس جو لندن میں ہوئی تھی اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ جس میں ہمارے لیڈران کو لندن بات چیت کرنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر برطانیہ سرکار ہم سے بات چیت کرنے پر رضا مند ہے اور ہماری بات سن کر کوئی فیصلہ کرنے پر وہ آمادہ ہے تو ان کے یہ کار پرداز جو ہندوستان میں وائسرائے اور گورنر جنرل کے روپ میں رخنہ ڈالتے رہتے ہیں، وہ کچھ نہ کر پائیں گے۔ چکبست انگریز سرکار کے اس رویے سے امید رکھتے ہیں کہ لندن میں کانفرنس میں جانے پر ساری باتیں طے ہو جائیں گی اگر پلانے والا پلا رہا ہے تو ہم کیوں نہ پئیں۔ ہم کوئی مانگ کر نہیں پی رہے ہیں، یعنی ہم کو اگر برطانیہ سرکار بات چیت سے باعزت طور پر ہماری مانگ پر غور کر کے ہمیں دینے کو تیار ہے تو ہم اسے لینے جا رہے ہیں۔

آزادی کی لڑائی کی بڑھتی طاقت کو دیکھ کر انگریز سرکار نے آپس میں پھوٹ ڈالنے کی چال چلنی شروع کر دی تھی۔ ۱۹۲۲ء-۱۹۲۵ کے درمیان پورے ملک میں شہر و دیہات میں انگریزوں نے بڑے بڑے فسادات کروانا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح حکومت نے بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے آزادی کی لڑائی کی تحریک کے دھارے کو فسادات کی طرف موڑ دیا اور ملک میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی جس نے آزادی کی لڑائی کو نقصان پہنچایا۔ اس جانب چکبست یہاں اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس طرح کی سیاہ حرکتوں میں کوئی مزہ نہیں رہا۔ لوگ اس میں زیادہ دلچسپی نہیں لیں گے۔ لوگوں کو اب صرف نئے دور کے آنے کا انتظار ہے اور سارا ملک اسی نئے دور کے لیے کوشاں رہے گا۔ نیا دور جب ہی آئے گا جب ہمیں 'ہوم رول' ملے گا اور ہم کو ایک طرح سے زندگی کی نئی شراب ملے گی۔ وہ نئے جینے کے طور طریقے لائے گی اور نئے ساقی ہوں گے یعنی ہمارے نئے لوگ ملک کے انتظام کار ہوں گے اور یہی حصول آزادی ہمارا کعبہ ہوگا اور کسی کا مندر یعنی ہندو مسلمان مل کر اس کو حاصل کریں گے۔ اس لیے شاعر دعا کرتا ہے کہ یہ شراب خانہ مراد یہ ملک ہمارا آباد رہے اور اس شراب خانہ میں جو نئے ساغر لائے جائیں گے یعنی جو نئے انداز اور رویے اپنے انتظامات کے لیے لانے ہیں وہ خیر و خوبی سے آجائیں۔

اگلے بند میں شاعر کہتا ہے کہ یہ ہماری شراب شوق یعنی ہماری نئی سوچ اور بی فکر کہ ہم اپنے ملک کے حاکم بنیں۔ ہمارے لیے دوا کا کام کرے گی۔ ہمارے سارے مریض جو آزادی حاصل کرنے کے مرض میں مبتلا ہیں بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہم کو 'ہوم رول' مل جانے سے جو اس کا نشہ آئے گا وہ ہمارے روح و جسم کے لیے اکسیر کا کام کرے گا۔ اکسیر ایسی دوا ہے جو مریض کو بالکل صحت مند بنا دیتی ہے اور آج کل کے زمانے میں گاندھی جی کی قیادت میں جو عام بیداری کی تحریک چلی ہے' یادگار رہے گی۔ لڑائی کے یہ سارے طریقے چاہے عدم تشدد سے لڑنے کی تحریک ہو یا عدم تعاون کی، یہ ساری تحریکیں 'ہوم رول' حاصل کرنے کا جو سودا ہمارے سر پر سوار ہے جب تک ہم ہوم رول حاصل کر لیں گے ہمارا یہ نشہ اترے گا نہیں۔

بند گیارہ میں شاعر کہتا ہے کہ اس وقت پورا ملک اس آزادی کی لڑائی کے نشہ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس میں ہندو مسلمان کا کوئی فرق نہیں۔ اگر ایک طرف گاندھی اور تلک ہیں تو دوسری طرف محمد علی جوہر، حسرت موہانی جیسے لوگ ہیں۔ ہوم رول کے حاصل کرنے کا نشہ مسجد والوں میں بھی برابر کا ہے۔ ان کی اذان کے نعروں میں اس کی دلکشی موجود ہے اور جدھر بھی نگاہ اٹھائے ایک نیا منظر نظر آتا ہے کہ ہندو مسلمان اسی کی دھن میں ہے اور یہ اس لیے ہے کہ یہ حکم ہمارے لیڈر اور رہنما مہاتما گاندھی کا ہے کہ ہم سب اس لڑائی کو لڑیں گے۔ اس لیے سارا راگ 'ہوم رول' کے نام پر آ کر مل جاتے ہیں۔ پیر مغاں کے معنی ہے شراب خانے کا نگراں، انتظام کرنے والا۔ مے معنی شراب یہاں شراب سے مراد ہے 'ہوم رول' کے نشے کی شراب جو ملک والوں نے پی رکھی ہے اور جس کی قیادت گاندھی جی کر رہے ہیں۔

بارہویں بند میں شاعر اپنے وقت کے ان حالات کی طرف اشارہ کر رہا ہے جب عدم تعاون کی تحریک گاندھی جی کی عدم تشدد تحریک سے مل کر زور پکڑ لیتی ہے، تو انگریز سرکار اس پر قابو پانے کے لیے بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے تحریک کا دھارا فرقہ وارانہ فساد کی طرف موڑ کر پورے ملک ہندوستان میں ہندو مسلمان فسادات کرا کر اپنی سمجھ میں آزادی کی لڑائی کو کمزور کرتی ہے اور آزادی کی لڑائی لڑنے والوں کو یہ جواب دیتی ہے کہ ہم کس کو حکومت سونپیں۔ اس لیے کہ آپ کے یہاں تو کئی رائیں ہیں۔ کانگریس کچھ کہتی ہے، مسلم لیگ کچھ کہتی ہے۔ ہم کس کی بات مانیں۔ آپ کے یہاں تو سات رنگی بات والے لوگ ہیں۔ ہر اادمی اپنا اپنا راگ الاپ رہا ہے نہ تو ایک مانگ ہے اور نہ ایک طرح کی بات۔ کوئی پارٹی کچھ کہہ رہی ہے کوئی کچھ مانگ رہی ہے، اس لیے شاعر کہتا ہے کہ اگر ایسا ماحول بنتا ہے تو سب کو چاہیے کہ ایک آواز ہو کر 'ہوم رول' کی مانگ کریں۔ اس پر سب مل کر ایک زبان ہو جائیں یہی سب سے بہترین بات ہوگی اور اسی مانگ میں ہماری جیت ہوگی اور ہمیں نئی روشنی ملے گی۔

تیرھویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ اس وقت جو میرے دل سے آواز نکل رہی ہے یہ وہی آواز ہے جو پورے ہندوستان کی طرف سے ہے۔ اور یہ وہ صدا ہے جس پر گوپال کرشن گوکھلے کو بڑا ناز تھا۔ وہ اب ہمارے درمیان نہیں ہیں وہ ہمارے ملک کے سب سے بڑے لیڈر اور گاندھی جی کے استاد اور گرو تھے۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ ہم کو ہوم رول مل جائے اور بلاشبہ ان کی اس خواہش اور چاہت میں بڑا دم تھا۔ ان کی یہ آرزو اور تمنا ہمارے دلوں میں مستی لاتی ہے اور ہمارے غریب و نادار ملک ہندوستان جو ایک طرح سے بیمار سا ہے اس کے بیماری کی دوا یہی ہوم رول ہے۔ اس کو حاصل کر کے ہمارا ملک تندرست ہو جائے گا۔ ہماری ناداری، مجبوری، مظلومی کا علاج ہو جائے گا اور جب تک ہمیں ہوم رول نہ مل جائے گا ہم کو چین و سکون نہ آئے گا۔ اس لیے ہمارے قوم کے فقیر یعنی ہمارے ملک کے فقر و قناعت کر کے زندگی گزارنے والے بڑے لیڈران یہ لو لگائے ہوئے ہیں۔ یہ آرزو اور تمنا کیا بنائے ہوئے ہیں کہ ہمیں ہوم رول حاصل ہو جائے گا۔

آخری بند میں شاعر کہتا ہے کہ انگریز سرکار لاکھ ہم کو دبانا چاہے۔ اس کے پاس حکومت ہے، طاقت ہے، دولت ہے، پولیس ہے،، سب کچھ ہے، ان کے ساتھ وقت اور زمانہ ہے لیکن اب ہمارے ولولے جوش اور عزم اتنے آگے بڑھ چکے ہیں کہ ان کو کسی کی طاقت سے دبایا نہیں جا سکتا ہے۔ ہماری رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی گرمی اب ہم کو ہوم رول حاصل کرائے بغیر ٹھنڈی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے جوش اور حوصلوں کو تیز کرنے میں جو آگ کام کر رہی ہے اس کو کوئی پانی سے بجھا نہیں سکتا اور اب ہمارے دل میں جب یہ ارمان آ گیا ہے کہ ہم ہوم رول لے کے رہیں گے تو یہ عزم اب جا نہیں سکتا اور آخری بند میں شعر میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر کانگریس میں ہی آپس میں یہ سوچ پیدا ہو رہی ہو کہ ہم ہوم رول کے بجائے مکمل آزادی لیں گے تو اس کی مانگ کرنا ایک فضول بات ہوگی۔ اس لیے کہ اس میں اور مسائل جو بیرون ممالک سے متعلق ہوں گے اور اتنی پیچیدگیاں

رکھتے ہیں کہ وہ کانٹے کی طرح ہم کو اپنے میں الجھائیں گی۔ ہمارے حالات کے مطابق اس وقت ہوم رول حاصل کرنا ہمارے لیے بہشت سے بھی بہتر اور بڑھ کر ہے۔ ہم ہندوستانیوں کو صرف ہوم رول چاہیئے اور اس کے بدلے میں کچھ اور نہ چاہیئے۔

10.6 فرہنگ

آوزۂ قوم	قوم یعنی ملک والوں کی آواز
خاک	مٹی
لہو	خون
رگوں	نسوں
بیداری	جاگنا
عرش	آسمان
شباب	جوانی
ہوم رول	حکومت خود اختیاری۔ یہ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں پہلی مانگ تھی، جس میں کچھ معاملے میں انگریز سرکار کو بنے رہنے کی بات بھی تھی۔ جو ۱۹۳۰ء کے بعد مکمل آزادی کی مانگ میں بدل گئی تھی۔
تماشائی	دیکھنے والا
گام	قدم
جبیں سائی	ماتھا گھسنا
بہر زیارت	دیکھنے کے لیے، درشن کے لیے
آرزو	تمنا
مہر وفا	مہربانی اور وفا
مرغ	پرندہ
مرغ خوش الحان	مراد ہمارے اچھے اچھے لیڈران، ایسے پرندے جن کی آواز بھلی لگتی ہے
سر پر شاہ	بادشاہ کا تخت، بادشاہ کی حکومت، انگریزوں کی حکومت
محافظ	محافظت کرنے والا
تاج دار	بادشاہ
قفس	پنجڑا
آشیاں	گھونسلا
بکس	کھلنا
عالمگیر	دنیا میں پھیلا ہوا، آفاقی
تقصیر	قصور، غلطی
داب سلطنت	سلطنت حاصل کرنے کی لگن

ڈگے	بلے
محضر	عہد نامہ
رخنہ اندازی	خلل ڈالنا
قناعت	جو مل جائے اسی پر راضی ہونا
دیروحرم	مندر اور مسجد
اکسیر	تیز فائدہ کرنے والی دوا
خلد	جنت
کہن	پرانی
پیر مغاں	شراب خانے کا نگراں، مالک
شیدا	عاشق
صدا	آواز
ناز	گھمنڈ
مسیحا	حضرت عیسیٰ جن کا معجزہ تھا کہ مردہ کو زندہ کر دیتے تھے
آزار	تکلیف، سختی
فقیر	فقر و قناعت سے کام لینے والے، درویش
فقیر قوم	ملک کے لیڈران
لو	آس، امید

10.7 اپنی معلومات کی جانچ کیجیے

1- چکبست کا پورا نام کیا ہے؟
2- چکبست کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
3- چکبست نے کب اور کہاں انتقال کیا؟
4- چکبست کی مختصر سوانح پندرہ سطروں میں لکھئے۔
5- آوازۂ قوم کے معنی تحریر کیجیے۔
6- چکبست کے کلام کو قومی ترانہ کیوں کہا جاتا ہے؟
7- 'ہوم رول' کیا ہے؟
8- گوپال کرشن گوکھلے کون تھے؟
9- گاندھی جی کی عدم تشدد کی تحریک کیا تھی؟
10- پہلی گول میز کانفرنس کب اور کہاں ہوئی تھی؟

10.8 نمونۂ امتحانی سوالات

۱۔چکبست کی حیات پر روشنی ڈالیے؟
۲۔چکبست کی نظم گوئی پر اظہار خیال کیجیے؟
۳-چکبست کی نظم ’آوازۂ قوم‘ کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے ؟

10.9 سفارش کردہ کتابیں

(۱)پنڈت برج نرائن چکبست ازعزیز نبیل (مرتب)
(۲)اردوادب کی تنقیدی تاریخ ازسید احتشام حسین
(۳)جدیداردونظم نظریہ وعمل ازپروفیسر عقیل احمد صدیقی

اکائی 11 علامہ اقبال-شعاع امید

ساخت

11.1 اغراض ومقاصد
11.2 تمہید
11.3 محمد اقبال کا تعارف
11.3.1 حالات زندگی
11.3.2 شاعری کی خصوصیات
11.4 اقبال کی نظم ''شعاع امید''
11.4.1 متن، ڈاکٹر سر محمد اقبال
11.4.2 تشریح
11.5 خلاصہ
11.6 اپنی معلومات کی جانچ۔نمونہ سوالات
11.7 نمونہ امتحانی سوالات
11.8 سفارش کردہ کتابیں

11.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں محمد اقبال کی مختصر حیات اور ان کی نظم نگاری کی مجموعی خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ان کی بڑی مشہور نظم ''شعاع امید'' کی مختصر تشریح بھی کی گئی ہے،جس میں ان کی شعری خوبیاں بھی بیان کی گئی ہیں۔اس سبق کو غور سے پڑھنے کے بعد آپ کو اتنا علم ہو جائے گا کہ:

محمد اقبال کی زندگی اور ان کی شاعری پر گفتگو کر سکیں۔
نظم ''شعاع امید'' کو بہت اچھی طرح سمجھ سکیں اور اس کی تشریح بھی کر لیں۔
اقبال کی اس نظم کا خلاصہ بھی بیان کر سکیں۔

11.2 تمہید

اردو ہندوستان کی جدید زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔زیادہ سے زیادہ سے چار سو سال قدیم کہا جا سکتا ہے لیکن حیرت ہے کہ اس کم مدت میں اس نے شعر و ادب کا اتنا بڑا ذخیرہ پیدا کیا جو دوسری جگہ نظر نہیں آتا۔خاص طور پر غزل جیسی مقبول شاعری تو کہیں نہیں ہے۔صرف غزل ہی نہیں اقبال جیسا نظم کہنے والا شاعر بھی بڑی مشکل سے دکھائی دے گا۔ہماری نظم نگاری کی تاریخ

بھی غزل سے کم نہیں ہے۔مگر غزل کو سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔نظم نگاری کو اقبال نے سب سے زیادہ بلندی بخشی ہے۔

11.3 محمد اقبال کا تعارف

11.3.1 حالات زندگی

محمد اقبال پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے دادا شیخ محمد رفیق کشمیر سے آئے تھے اور پنجاب میں بس گئے تھے۔ان کے بیٹے یعنی اقبال کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ وہ بہت نیک، دیندار اور خدادوست انسان تھے۔ پورے شہر میں وہ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔اقبال کی والدہ کا نام امام بی بی تھا۔ یہ بھی بہت شریف، نیک مزاج اور خداترس خاتون تھیں۔اقبال ان سے بہت محبت کرتے تھے۔شیخ نور محمد کے دو بیٹے تھے۔شیخ عطامحمد اور شیخ محمد اقبال، شیخ عطامحمد اپنے چھوٹے بھائی اقبال کی تعلیم وتربیت میں حد درجہ دلچسپی رکھتے تھے اور اقبال کی اعلیٰ تعلیم کے ذمہ دار تھے۔اقبال بھی بڑے بھائی کا بڑا احترام کرتے تھے۔اقبال کی تین بہنیں تھیں۔انھوں نے ابتدائی تعلیم محلے کے مدرسہ میں حاصل کی۔اس کے بعد اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ میں داخل ہوئے۔۱۸۹۳ء میں انٹرنس پاس کیا۔اس اسکول میں ان کے سب سے محترم استاد مولانا میر حسن بھی درس دیا کرتے تھے۔انھیں اقبال گر کہا جاتا ہے۔سیالکوٹ کے اسکول سے ایف اے کرنے کے بعد وہ لاہور گئے۔ گورنمنٹ کالج میں ۱۸۹۵ء میں داخل ہوئے۔۱۸۹۷ء میں بی اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ایم اے کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں استاد مقرر ہوئے۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے۱۹۰۵ء میں یورپ گئے۔ وہاں سے پی ایچ ڈی اور بیرسٹری کی ڈگری لے کر ۱۹۰۸ء میں واپس آئے۔لاہور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔وکالت کے علاوہ تدریس اور سماجی کاموں میں بھی ان کی دلچسپی رہی۔وہ پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔راونڈ ٹیبل کانفرنس میں ملک کی آزادی کے لیے دوبار لندن گئے۔کئی ملکوں کا سفر کیا اور اہم لکچر دیے۔ ۲۱راپریل ۱۹۳۸ء کو ان کا انتقال ہوا۔ان کے دو بچے تھے۔جاوید اور لڑکی کا نام منزہ تھا۔اردو فارسی شاعری کے مجموعے ان کی زندہ یادگار ہیں۔نثر میں بھی ان کی کئی کتابیں ہیں جن میں فلسفیانہ خطبات (انگریزی) کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کے لیے

(۱)اقبال کا نام کیا تھا؟

(الف)اقبال احمد　　(ب) شیخ اقبال

(ج) شیخ محمد اقبال　　(د) سر اقبال

(۲)اقبال کی جائے پیدائش کا کیا نام ہے؟

(الف)لاہور　　(ب)راولپنڈی

(ج)اسلام آباد　　(د) سیالکوٹ

(۳)اقبال یورپ سے کون سی ڈگری لے کر واپس آئے؟

(الف)ایم ڈی　　(ب) پی ایچ ڈی

(ج)ایل ایل ڈی　　(د)ایم اے

(۴)اقبال کا کب انتقال ہوا؟

(الف)۱۹۴۰ء (ب)۱۹۳۶ء

(ج)۱۹۳۸ء (د)۱۹۴۲ء

(۵)اقبال کے والد کا کیا نام تھا؟

(الف) شیخ نور محمد (ب)محمد نور

(ج)نور احمد (د)محمد رفیق

11.3.2 شاعری کی خصوصیات

محمد اقبال اردو کے سب سے عظیم شاعر ہیں۔ انہیں جو شہرت اور مقبولیت ملی وہ کسی کو حاصل نہ ہو سکی۔ ان کی بدولت ہماری شاعری کو دنیا کے ادب میں اونچا مقام ملا۔ بچپن سے آخر عمر تک وہ شعر کہتے رہے۔ کلام کا بہت بڑا ذخیرہ ان کی یادگار ہے۔ جس میں اردو کے چار شعری مجموعے شامل ہیں۔ بانگِ درا، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغانِ حجاز۔ ان کے علاوہ فارسی میں اسرارِ خودی، رموزِ بیخودی، پیام مشرق، جاوید نامہ، زبورِ عجم، پس چہ باید کرد، گلشن ساز جدید، ارمغانِ حجاز وغیرہ شعری مجموعے ہیں۔

ہماری شعری روایت میں اقبال کا اردو کلام ایک حیرت انگیز اضافہ ہے۔ وہ ہمارے جذبات اور محسوسات کا ایک ایسا مرکب ہے جس میں ان گنت پہلو شامل ہیں۔ انھوں نے بچپن میں ہی غزل سے شاعری کی ابتدا کی مگر دو چار سال بعد نظمیں کہنے لگے۔ انیسویں صدی کے آخر میں ان کا کلام عام ہو چکا تھا۔ بڑے بڑے مشاعروں میں ان کی شرکت ہونے لگی تھی۔ شعر کہنے کی انھیں ایک خداداد قوت ملی تھی، جو کسی کرشمہ سے کم نہیں ہے۔ وکالت کرتے ہوئے شاعری کا اتنا بڑا سرمایہ تخلیق کرنا یہ عظیم شاعر کا ہی کمال ہو سکتا ہے، جب کہ قومی اور سیاسی معاملات میں بھی ان کی دلچسپی کم نہ تھی۔ ۶۳ سال کی زندگی میں ادب کی یہ خدمت شاید ہی کہیں نظر آئے۔ ان کی زندگی اور شاعری اصلاحی اور پیامی جذبات میں ڈوبی ہوئی تخلیق کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ اقبال کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت فکر اور فن کا خوبصورت امتزاج ہے۔ جس سے اردو شاعری آشنا نہ تھی، گہرے سے گہرے اور پیچیدہ خیالات کو شعر کے دل کش اسلوب میں پیش کیے جانے کی ایسی مثال کہیں نہیں دستیاب ہے۔ یہ اقبال کی ہنر مندی ہے کہ انھوں نے فلسفہ وفکر کو شعر کی زبان دے دی اور اردو شاعری کو فلسفیانہ خیالات ادا کرنے کا ہنر دے دیا۔ انھوں نے اپنے خاص فلسفہ خودی اور بے خودی کو سورنگ میں شعر کی خوبصورتی بخشی۔ دوسرے تمام فکری خیالات کا بھی یہی حال ہے۔ فن کے وہ تمام محاسن بھی ان کے کلام میں ہر جگہ بکھرے ہیں، جیسے تشبیہ واستعارہ، منظر محاکات، مکالمہ وپیکر تراشی، جذبہ واحساس کی سرشاری، غرض ان کے کلام میں فنی کمالات کی ہر مثال موجود ہے۔

اقبال بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ انھیں بیانیہ پر قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے روایت سے ہٹ کر غزل کو نیا امتیاز اور رنگ وآہنگ دیا۔ مگر ان کی بڑی پہچان ان کی نظموں سے ہوتی ہے۔ مختصر اور طویل ہر طرح کی نظمیں لکھی ہیں۔ ان سب میں ان کا فلسفہ، پیغام اور ایک غلام قوم کی بیداری کے ساتھ ظلم وزیادتی کے خلاف ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار رہنے کا سبق موجود ہے۔ اس میں اتنا ہی جوش وخروش کے ساتھ انقلاب واحتجاج کی آوازیں موجود ہیں۔ جو ملک کی آزادی اور انگریزی حکومت کے خاتمے کے لیے ضروری تھیں۔ اس طرح وہ ملک کے سب سے بڑے انقلابی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں سوز وگداز کے ساتھ ایک دردمندی اور انسان دوستی کا بڑا گہرا پیغام موجود ہے۔ جسے وہ احترام انسانیت سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی پوری شاعری میں انسانی قدروں کے لازوال نغمے ان کے خلوص اور روح کی آواز بن کر گونجتے ہیں۔ انھوں نے نظم نگاری کو

بہت وسعت دی اور ہر طرح کے موضوعات کوقلم بند کیا۔ تاریخی، سیاسی، واقعاتی مضامین کے دوش بدوش مذہبی، جذباتی، تصوراتی عنوانات بھی بڑی شعری کشش کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ جن میں نغمگی، شعریت کے علاوہ فن کی نزاکتوں کے ساتھ پڑھنے والوں کے دل ودماغ میں اترنے والی پُر جوش کیفیت بھی اثر آفریں بن گئی ہے۔ ان کا کلام ہمیں حد درجہ متاثر کرتا ہے اور ان کا پیغام عمل کے لیے آمادہ یا متحرک کرتا ہے۔ شروع کے دور کی چھوٹی سی نظم ''بچے کی دعا'' ہے۔ یہ دنیا میں سب سے زیادہ گائی اور پڑھی جانے والی نظم ہے۔ قومی ترانے کا بھی یہی حال ہے۔ ان کی بہت سی نظمیں ہر نصاب میں شامل ہیں۔

موجودہ نظم ان کے آخری دنوں کی غالباً ۱۹۳۵ء کے آس پاس کی یادگار ہے۔ یہ بے حد خوبصورت اور ہر ایک کو متاثر کرنے والی ایک دلکش تخلیق ہے، جس کی ہر ایک نے تعریف کی ہے۔ اس نظم میں پیکر تراشی کے بے مثال خیال کو ایک زندہ اور مچلتے ہوئے انسان کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ سورج اور اس کی کرنوں کی گفتگو کو سننے نہیں بلکہ دیکھنے کا لطف محسوس ہوتا ہے۔ اقبال کی ہندوستان سے بے پناہ محبت اور جذباتی لگاؤ کے بیان میں یہ ایک شاہکار نظم ہے۔ اور فنی کمال کی عظیم مثال بھی ہے۔ اس نظم کو بار بار پڑھیے اور لطف لیجئے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

(۶) اقبال نے اپنے پیغام کے اظہار کے لیے کس صنف کو زیادہ استعمال کیا ہے؟

(الف) غزل　　(ب) مثنوی

(ج) نظم　　(د) رباعی

(۷) نظم 'شعاع امید' کس کتاب میں شامل ہے؟

(الف) بال جبریل　　(ب) ضرب کلیم

(ج) بانگ درا　　(د) ارمغان حجاز

(۸) اس مصرع کو مکمل کیجیے۔

میرے اللہ......................بچانا مجھ کو

(۱۰) اس شعر کو مکمل کیجیے۔

مشرق سے......................حذر کر

فطرت کا......................سحر کر

11.4 اقبال کی نظم ''شعاع امید''

11.4.1 متن، ڈاکٹر سر محمد اقبال

شعاع امید

۱-سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام　　دنیا ہے عجب چیز کبھی صبح کبھی شام
۲- مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں　　بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریٔ ایام
۳-نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت　　نے مثلِ صبا خوفِ گل و لالہ میں آرام
۵-آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں　　بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہے ہم آغوش

۶-اک شور ہے، مغرب میں اجالا نہیں ممکن افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
۷-مشرق نہیں گو لذتِ نقارہ سے محروم لیکن صفت عالم لاہوت ہے خاموش
۸-پھر ہم کو اسی سینہ روشن میں چھپالے اے مہر جہاں تاب! نہ کر ہم کو فراموش

11.4.2 تشریح

۱- ہندوستان غلام ملک ہے۔ یہاں کے لوگ غلامی کی تکلیف برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ ان میں غلامی کے خلاف بغاوت یا انقلاب کی کوئی آرزو باقی نہیں رہی۔ اس کیفیت کو دیکھ کر سورج بہت مایوس ہے وہ اپنی کرنوں کو پیغام سناتا ہے کہ دنیا کا عجیب مزاج ہے۔ اس میں روشنی ہے اور تاریکی بھی، صبح وشام ایسے ہی گزر رہے ہیں۔

۲- تبدیلی کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔ ایک عرصہ سے تم زمین وآسمان کی اس وسیع فضا میں چکر لگا رہے ہو مگر اندھیرا بڑھتا ہی جارہا ہے۔ وقت کی سنگدلی میں اضافہ ہورہا ہے۔

۳- ریگستان کے ذروں پر چمکنے میں کوئی مزہ نہیں ہے اور نہ ہی چمن زار میں ہواؤں کی طرح لالہ اور گلاب کے پھولوں کے بوسے اور چومنے میں کوئی لطف ہے۔

۴- جب ہر جگہ تمہاری چمک سے اندھیرا ہی اندھیرا ہو تو بہتر ہے کہ تمام کرنوں واپس آجاؤ، باغ وصحرا سب کو چھوڑ کر میرے روشن دل میں بسیرا کرو۔

سورج کا یہ پیغام سن کر

۵- زمین وآسمان کے ہر کونے سے شعاعیں اٹھتی ہیں اور ایک مدت تک دور رہ کر ساری کرنیں سورج سے گلے ملنے کے لیے ٹوٹ پڑتی ہیں۔

۶- چاروں طرف ایک شور برپا ہے کہ مغرب یعنی یورپ میں روشنی پھیلنے کا امکان نہیں رہا کیوں کہ وہاں مشینوں کے دھوئیں سے پوری فضا آلودہ ہے اور انگریزوں کا تن من سب کالا ہو چکا ہے۔

۷- مشرق یعنی ایشیا خاص طور پر ہندوستانی روشنی سے محروم نہیں ہے۔ وہ نظارے کی لذت سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے لیکن یہاں سکوتِ مرگ کی خاموشی طاری ہے، کوئی جنبش یا حرکت نہیں ہے۔

۸- کرنیں سورج سے درخواست کرتی ہیں کہ تو مجھے اپنی روشنی میں چھپالے۔ دنیا کو روشنی بخشنے والے سورج ہمیں نظرانداز نہ کر۔ ہم تیری پناہ میں خود واپس آنا چاہتے ہیں۔

۹- کرنوں کی یہ گفتگو جاری تھی کہ یکایک ایک نگاہِ حور جیسی چمک رکھنے والی کرن ظاہر ہوتی ہے۔ اسے آرام حرام ہے اور پارے کی طرح مچلتے رہنا اس کی فطرت ہے۔

۱۰- وہ شوخ کرن سورج سے التجا کرتی ہے کہ مجھے اجازت دیجئے کہ مشرق کے ہر ذرے کو جب تک روشن نہ کرلوں واپس نہ آؤں۔

۱۱- جب تک گہری نیند میں پڑے سونے والے جاگ نہ جائیں تب تک میں ہندوستان کی اندھیری سرزمین کو نہیں چھوڑوں گی۔

۱۲- سورج یعنی روشنی کا مرکز یہی ہندوستان ہے۔ ہندوستان کی مٹی اقبال کے آنسوؤں سے نم ہے۔ ملک کی غلامی سے اقبال

رنجیدہ ہیں۔

۱۳- اس ملک کی خاک کی بدولت ہی چاند اور ستاروں کی آنکھوں میں روشنی یا چمک ہے۔ یہاں کی مٹی کے ٹکڑے بھی چمک دار موتیوں کی مانند ہیں۔

۱۴- یہاں کی خاک سے ایسے بہادر شناور یا تیراک پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے ہر سمندر کے طوفان کو جواں مردی سے پار کیا ہے۔ یہاں کے عظیم انسانوں کی موجودگی کی طرف اشارہ ہے۔

۱۵- ان سب کے باوجود آج یہ ملک غلام ہے۔ یہاں کے ہر نغمے اور ہر موسیقی میں دلوں کو گرمانے اور جوش پیدا کرنے کی خصوصیت تھی۔ افسوس ہے کہ آج ہی ساز و آواز سب بے حس و حرکت اور خاموش ہیں۔

۱۶- پجاری ملک کی بدحالی سے بے نیاز ہو کر مندروں کے دروازوں پر خوابِ غفلت میں پڑا ہے۔ تو دوسری طرف غازی مسجدوں میں اپنی بد قسمتی پر رو رہا ہے یعنی ہندو مسلمان کے دل جوش و خروش سے خالی اور ملک کی بدحالی سے غافل ہیں۔

۱۷- نظم کے آخری شعر میں اقبال مایوسی کی فضا کو ختم کرتے ہوئے اپنے پیغام کو قانونِ فطرت کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ہمیں مشرق اور مغرب یعنی ہندوستان اور یورپ سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور نہ ان سے تعلق ترک کرنا چاہیے۔ بلکہ ضرورت ہے کہ ہر تاریکی کو روشنی میں تبدیل کر دیں کیوں کہ قدرت کا نظام ہے کہ رات کا اندھیرا صبح کے اجالے میں بدل جاتا ہے۔

11.5 خلاصہ

(۱) اقبال ایک عظیم فلسفی شاعر ہیں۔

(۲) انھوں نے اردو فارسی دونوں زبانوں میں اعلیٰ شاعری کی۔

(۳) وہ وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے۔ مگر قومی معاملات اور اصلاحی رجحان کے مالک تھے۔

(۴) وہ ایک بڑے پیامی شاعر تھے۔ ان کے اشعار میں کوئی نہ کوئی درس یا پیغام ملتا ہے۔

(۵) وہ خود ایک اپنا فلسفۂ حیات رکھتے تھے، جسے خودی اور بیخودی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

(۶) انھوں نے غزلوں کا ایک ذخیرہ چھوڑا ہے جس میں ان کی اپنی الگ پہچان موجود ہے، جس کی پیروی نہ ہو سکی۔ ان کا لب ولہجہ بالکل ناپید ہے۔

(۷) شعری فن کاری میں بھی انھوں نے فن کو معراج کی بلندی عطا کی ہے۔

(۸) وہ دنیا کے انسانوں کے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں۔

(۹) وہ جبر و ظلم کے خلاف انقلابی آواز کے مالک ہیں۔

(۱۰) دنیائے ادب میں فلسفہ و شعر کا ایسا خوبصورت امتزاج صرف اقبال کے یہاں ملتا ہے۔

11.6 اپنی معلومات کی جانچ۔ نمونہ سوالات

(۱) (الف) شیخ محمد اقبال

(۲) (د) سیالکوٹ

(۳) (ب) پی ایچ ڈی

(۴) (ج)۱۹۳۸ء

(۵) (الف) شیخ نور محمد

(۶) (ج) نظم

(۷) (ب) ضرب کلیم

(۸) (الف) بانگ درا

(۹) میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو

(۱۰) مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

11.7 نمونہ امتحانی سوالات

حسب ذیل سوالوں کے جواب تقریباً ۳۰ سطروں میں لکھئے۔

(۱) اقبال کی سوانح حیات پر نوٹ قلم بند کیجیے۔

(۲) اقبال کی نظم نگاری کی خوبیاں بیان کیجیے۔

11.8 سفارش کردہ کتابیں

(۱) ذکر اقبال، عبدالمجید سالک

(۲) شعر اقبال، عابد علی عابد

(۳) نقوشِ اقبال، ابوالحسن علی ندوی

اکائی 12 جوش ملیح آبادی-البیلی صبح

ساخت

12.1 اغراض ومقاصد

12.2 تمہید

12.3 جوش ملیح آبادی

12.4 متن: البیلی صبح

12.5 نظم 'البیلی صبح' تشریح

12.6 نظم کے مشکل الفاظ کے معنی

12.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

☆ جوش کی حیات اور شاعری پر اظہار خیال کرسکیں گے۔

☆ نظم 'البیلی صبح' کی تشریح کرسکیں گے۔

☆ نظم کی تفہیم وتحسین کرسکیں گے۔

☆ نظم کا خلاصہ اور مرکزی خیال بیان کرسکیں گے۔

☆ جوش کی شاعری کے اسلوب سے واقف ہوں گے۔

12.2 تمہید

جوش ۵/دسمبر ۱۸۹۶ء میں لکھنو کے مشہور اور سرسبز وشاداب تحصیل ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ انقلابی شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے انقلابی لہریں اور بدلتے ہوئے سماجی حالات ان کی شاعری کے موضوع ہیں۔ نئے انداز کی نظمیں سامنے آئیں۔ مشہور نظم ''کسان'' سے وہ بہت مشہور ہوئے۔ اس درمیان کئی شعری مجموعے بھی سامنے آئے جن میں روح ادب (۱۹۲۱ء) کے بعد شعلہ وشبنم (۱۹۳۶ء) نقش ونگار (۱۹۳۶ء) کی نظموں نے ان کو بہت شہرت دلائی۔ اس کے بعد جنون وحکمت، حرف وحکایت، جیسے مجموعے ان کی انقلابی فکر ونظر سامنے لائے۔ ۱۹۵۴ء میں انھیں پدم بھوشن کا اعزاز عطا ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں اپنے نجی حالات سے مجبور ہوکر جوش پاکستان چلے گئے اور ۲۲/فروری ۱۹۸۲ء کو انتقال ہوا۔ اسلام آباد میں تدفین ہوئی۔ وہ غزل، نظم اور رباعی تینوں اصناف کے بلند شاعر ہیں۔

12.3 جوش ملیح آبادی

جوش اردو شاعری کا ایک اہم نام ہے۔ انہیں شاعر انقلاب اور شاعر شباب کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان کا پورا نام شبیر حسن خاں اور جوش تخلص ہے۔ وہ ۵/دسمبر ۱۸۹۶ء میں لکھنو کے مشہور اور سرسبز وشاداب تحصیل ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام بشیر احمد خاں تھا۔ وہی اپنے وقت کے اچھے شاعر تھے۔ بشیر احمد تخلص کرتے تھے۔ ان کے دادا کا نام نواب احمد خاں تھا۔ صاحب دیوان شاعر تھے، ان کا دیوان 'مخزن آلام' کے نام سے شائع ہوا۔ ان کے پردادا نواب فقیر محمد خاں گویا جاگیردار بھی تھے، وہ شاعر اور اچھے نثر نگار تھے۔ انھوں نے انوار سہیلی کا ترجمہ اردو نثر میں بستان حکمت کے نام سے کیا۔ ان کے خاندان میں کئی پشت سے شعروشاعری کا سلسلہ چلا آرہا تھا۔ جوش نے بھی نو (۹) دس (۱۰) برس کی عمر سے شاعری شروع کردی۔ پہلے غزلیں کہتے تھے اور اس میں رومانی پہلو نمایاں تھا۔ ان کے یہاں ابتدا میں رومانیت غالب تھی۔ غزل کے علاوہ نظموں میں بھی یہ رنگ نظر آتا ہے۔ جیسے ''عاشق نواز'' چاند کے انتظار میں، جفائے وفا، پہلی مفارقت، زرد کلیاں، وغیرہ رومان پرور نظمیں ہیں۔ ۱۹۲۴ء تک ان پر رومانیت کا غلبہ تھا۔ ۱۹۳۵ء میں وہ حیدرآباد گئے وہاں سے ان کی زندگی اور فکر میں ایک نیا موڑ آیا۔ ۱۹۳۵ء میں انھوں نے دہلی سے رسالہ کلیم جاری کیا اور ۱۹۴۸ء میں آج کل رسالہ کے مدیر ہوئے۔ اس درمیان ہندوستان کے انقلاب کی لہریں اور بدلتے ہوئے سماجی حالات ان کی شاعری کا موضوع بنے۔ نئے انداز کی نظمیں سامنے آئیں۔ مشہور نظم ''کسان'' سے وہ بہت مشہور ہوئے۔ اس درمیان کئی شعری مجموعے بھی سامنے آئے جن میں روح ادب (۱۹۲۱ء) کے بعد شعلہ وشبنم (۱۹۳۶ء) نقش ونگار (۱۹۳۶ء) کی نظموں نے ان کو بہت شہرت دلائی۔ اس کے بعد جنون وحکمت، حرف وحکایت، جیسے مجموعے ان کی انقلابی فکر ونظر سامنے لائے۔ ۱۹۵۴ء میں انھیں پدم بھوشن کا اعزاز عطا ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں اپنے نجی حالات سے مجبور ہوکر جوش پاکستان چلے گئے اور ۲۲/فروری ۱۹۸۲ء کو انتقال ہوا۔ اسلام آباد میں تدفین ہوئی۔ وہ غزل، نظم اور رباعی تینوں اصناف کے بلند شاعر ہیں۔

12.4 متن: البیلی صبح

البیلی صبح

نظر جھکائے عروس فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحرا کا تارا ہے زلزلے میں، افق کی لو تھرتھرا رہی ہے
روش روش نغمہ مطرب ہے، چمن چمن جشن رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں، کلی کلی گنگنا رہی ہے
ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگار مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے
طیور بزم سحر کے مطرب، لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیم فردوس کی سہیلی، گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے
کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں یہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی پری مسکرا رہی ہے
سحر کو مد نظر ہیں کتنی رعایتیں چشم خوں فشاں کی
ہوا بیاباں سے آنے والی، لہو میں سرخی بڑھا رہی ہے

شلو کا پہنے ہوئے گلابی ، ہر اک سبک پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا ہوا میں پلو سکھا رہی ہے
فلک پر اس طرح چھپ رہے ہیں، ہلال کے گرد وپیش تارے
چلو کہ جیسے کوئی نئی نویلی جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے
کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر؟ چٹکتی کلیوں ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رو میں، یہ کس کی آواز آ رہی ہے

12.5 نظم 'البیلی صبح' تشریح

جوش ایک رومانی شاعر ہیں اپنی رومانیت پسندی کی وجہ سے جوش نے مناظر فطرت کا بڑے غور وفکر سے مشاہدہ کیا ہے۔ان کو منظر کشی میں مہارت حاصل ہے۔مناظر چاہے فطری ہوں یا تخیلی سب میں بڑی خوبصورت تصویر کشی کرتے ہیں۔البیلی صبح ان کی ایسے ہی حسن کاری اور فن کاری کا بہترین نمونہ ہے۔ جوش نے اس نظم میں صبح کو ایک خوبصورت دلہن بنا کر پیش کر دیا ہے۔ جس میں صبح کی خوبصورتی اور حسن ایک زندہ دل، بھولی بھالی دلہن سے مشابہ ہے اور شاعر نے صبح کو البیلی صبح کا نام دیا ہے۔

۱- نظم کے پہلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ فطرت کی دلہن شرماتے اور لجاتے ہوئے نظریں نیچی کیے اپنے چہرے سے رات کی زلفیں دھیرے دھیرے ہٹا رہی ہے۔یعنی صبح کا اجالا دھیرے دھیرے بڑھ رہا ہے اور رات کا اندھیرا جو بال کی طرح کالی رنگت کا تھا گھٹ رہا ہے۔ایسے وقت میں رات کے وقت کے چمکتے ہوئے تارے بھی جھلملانے لگتے ہیں۔جس کو شاعر نے یہاں پر زلزلے میں ہونے سے بتایا ہے اور افق یعنی آسمان کا وہ کنارہ جہاں سے سورج نکلتا ہے وہاں بھی ایک طرح کی تھر تھراہٹ معلوم ہورہی ہے۔یعنی ہلکی ہلکی کانپتی ہوئی سرخی افق پر آجاتی ہے یہ فطرت کی منظر کشی کا بہت دلکش نمونہ ہے۔

۲- ہر راستے خوشی کا گانا گا رہے ہیں اور ہر باغ میں رنگ اور خوشبو کا جشن منایا جا رہا ہے۔اور پیروں کی ڈالوں پر بیٹھے پرندے غزل سنا رہے ہیں۔یعنی خوشی سے سریلی آواز میں چہک رہے ہیں اور ہر جانب جہاں جہاں پھولوں میں کلیاں ہیں وہ بھی گنگنا رہی ہیں یعنی صبح کے وقت کلیاں کل کھل کر پھول بن رہی ہیں۔ پورا ماحول نغمہ وگیت کے آہنگ سے جھوم رہا ہے۔

۳- صبح کے وقت آسمان پر ستارے ایسے لگتے ہیں جیسے کہ اپنی آنکھیں جھپکا رہے ہیں۔ کیونکہ رات بھر جاگے ہیں اس لیے ایسا نظارہ پیش کرر ہے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ ان کی جھکتی آنکھوں میں رات بھر کی کتنی کہانیاں اور قصے ہیں اور دوسری طرف چاند ایک محبوب کی طرح اپنی نشہ بھری نگاہ سے جادو جگا رہا ہے یعنی جادو کا سا اثر کر رہا ہے۔

۴- صبح کی محفل یا صبح کا منظر کے وقت کے گانے پرندے، پیڑوں کی لچکتی ڈالیوں پر بیٹھ کر گا رہے ہیں یعنی چہک رہے ہیں دوسری جانب صبح کی ٹھنڈی ہوا جو بہت اچھی لگنے والی ہوتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ جنت کی سہیلی ہے یعنی جس طرح جنت میں خوش حالی ہوگی اس طرح کا سکون اور مزہ دینے والی ہوا اس وقت پھولوں کو جھولا جھلا رہی ہے یعنی صبح کے وقت ہر ثمر دار پیڑوں کے پھول کھل رہے ہیں اور تازہ ہوا سے جھوم رہے ہیں۔

۵- بیلے کی کلی جو ابھی چٹخ کر پھول نہیں بنی ہے اس پر رات کی گرنے والی اوس کا ایک قطرہ کسی خوبصورتی سے پڑا ہوا ہے کہ دیکھنے والے کو دھوکا ہو رہا ہے کہ اوس کا قطرہ نہیں بلکہ ایک موتی چمک رہا ہے جس کو شاعر کہتا ہے کہ یہ شبنم کا قطرہ نہیں بلکہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی پری مسکرا رہی ہے۔ یہاں شبنم کے اس چمکتے قطرے کو شاعر نے ہیرے کی کیل سے تشبیہ دی ہے۔

۶- صبح کا منظر عجیب منظر ہوتا ہے۔اس کو کس کس طرح سے بیان کیا جائے۔ایک کے بے حساب پہلو ہوتے ہیں۔اوپر کے سارے بیانات کے ساتھ صبح کا وقت ایک منظر اور پیش کرتا ہے یعنی آسمان پر چاروں طرف سرخی پھیل جاتی ہے۔سورج کے نمودار ہونے سے پہلے جس کو شاعر کہتا ہے کہ خون کی لالی کا چھڑکاؤ ہو رہا ہے ایسے ماحول میں جنگل سے آنے والی ہوائیں ہمارے خون میں سرخی بڑھا رہی ہیں یعنی صبح کے وقت ہر انسان کے بدن میں پھرتی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

۷- صبح کے وقت باغ میں گلاب کی ہر پنکھڑی کھل کر جو اپنی ڈالیوں سے لپٹی ہوئی ہے تو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لمبی آستینوں والا کمر تک کا کرتا پہنے ہوئے اپنی رنگی ہوئی لال رنگ کی اوڑھنی کا آنچل ہوا میں سکھا رہی ہے۔یعنی اس وقت گلاب کی ہر ڈالی سرخ رنگ کے پھولوں سے لدی باغ میں کھڑی ہے۔

۸- اور آسمان میں ایک ایک کر کے سارے تارے چاند کے آگے پیچھے اس طرح چھپ رہے ہیں کہ جیسے کوئی نئی نویلی دلہن اپنی پیشانی یعنی ماتھے سے افشاں چھڑا رہی ہے۔

۹- اور آخر میں شاعر یہ کہتا ہے کہ صبح کے اس سہانے منظر کو بگاڑنے کے لیے کوئی نہ کوئی آجائے ایسی ایک کھٹک دل میں ہو چلی ہے۔یعنی شاعر اشارہ کر رہا ہے کہ صبح کا یہ سہانا منظر،سورج کے نمودار ہونے کے بعد دھیرے دھیرے تیزی سے غائب ہو جائیگا۔اس لیے کھلتی ہوئی کلیوں سے کہتا ہے کہ ذرا سنبھل کر،رک کر،اس کا بھی احساس بس کرنا کہ باغ کے ایسے ماحول خوش حال ماحول میں اس ماحول کو تر بتر کرنے والی ایک آہٹ نظر آرہی ہے اور وہ آمد ہے سورج کی لو اسے چٹکتی ہوئی کلیو! اس سے خوش ہوتی ہوئی کلیو، ہار سے پھول بنتی ہوئی کلیو،سورج کی تیزی کی طرف دھیان رکھنا۔، ہارے ی کی طرف کی دھیان رکھنا۔

12.6 نظم کے مشکل الفاظ کے معنی

لفظ	معنی
البیلی	بانکی،انوکھی عورت، زندہ دل عورت،بھلی عورت
عروس	دلہن
فطرت	نیچر،قدرت
جبیں	پیشانی
افق	آسمان پر جگہ جہاں سے سورج نمودار ہوتا ہے
روش	راستہ
نغمہ طرب	خوشی کا گانا
طیور	جمع ہے طائر، پرندہ
نگار	محبوب،معشوق
مہتاب	چاند
مطرب	گانے والے
نسیم	صبح کی ٹھنڈی ہوا

خون فشاں　　　　　خون کا چھڑکاؤ

12.7 نمونۂ امتحانی سوالات

ا۔جوش ملیح آبادی کی حیات پر روشنی ڈالیے؟

۲۔جوش ملیح آبادی کی نظم گوئی پر اظہار خیال کیجیے؟

۳-جوش ملیح آبادی کی نظم 'البیلی صبح' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے؟

12.8 سفارش کردہ کتابیں

ا۔جوش ملیح آبادی از جوش ملیح آبادی: انسان اور شاعر

۲۔اردو ادب کی تنقیدی تاریخ از سید احتشام حسین

۳۔جدید اردو نظم نظریہ و عمل از پروفیسر عقیل احمد صدیقی

بلاک ۔۵ کا تعارف:

بلاک ۔۵ دو اکائیوں پر مشتمل ہے۔ تیرہویں اکائی 'مجاز اور ان کی نظم آوارہ' پر ہے۔ مجاز لکھنوی بھی ان ہی شعرا میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقی کاوشوں سے ترقی پسند ادب میں بیش قیمتی اضافہ کیا۔

چودھویں اکائی 'اختر الایمان اور ان کی نظم ایک لڑکا' پر مشتمل ہے۔ اختر الایمان نے اپنی نظموں میں علامتوں اور استعاروں کے ذریعے احساسات کو پیش کیا۔ انھوں نے اپنی نظموں میں عام گفتگو کی زبان کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔

اکائی 13 اسرارالحق مجاز-آوارہ

ساخت

13.1 اغراض ومقاصد
13.2 تمہید
14.3 اسرارالحق مجاز کا تعارف
13.3.1 حالات زندگی
13.3.2 ادبی خدمات
13.4 مجاز کی نظم آوارہ
13.4.1 متن
13.4.2 تشریح
13.4.3 خلاصہ/مرکزی خیال، محاسن
13.5 سبق کی تلخیص
13.6 اپنے مطالعے کی جانچ، جوابات
13.7 نمونۂ امتحانی سوالات
13.8 سفارش کردہ کتب

13.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

☆ مجاز کی حیات اور شاعری پر اظہار خیال کرسکیں گے۔

☆ مجاز کی نظم کے ہر بند کی تشریح کرسکیں گے۔

☆ نظم کی تفہیم وتحسین کرسکیں گے۔

☆ نظم کا خلاصہ اور مرکزی خیال بیان کرسکیں گے۔

☆ ترقی پسند شعراء کے شاعری کے رنگ سے واقف ہوں گے۔

13.2 تمہید

آپ نے اب تک پہلے عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی کی نظموں کے علاوہ سرسید کے عہد اور علامہ اقبال کے دور کی نظموں کا مطالعہ کیا ہے۔نظم کی ترقی وترویج میں ترقی پسند شعرانے اہم کردار ادا کیا ہے۔ان شعرانے اشرافیہ طبقے کی جگہ غریبوں اور پس ماند

وطبقات کی طرف خاص توجہ دی۔ مجاز لکھنوی بھی ان ہی شعرا میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقی تخلیقی کاوشوں سے ترقی پسند ادب میں بیش قیمتی اضافہ کیا۔

13.3 اسرار حق مجاز کا تعارف (1911 تا 1955)

اسرار الحق نام اور مجاز تخلص کرتے تھے۔ اتر پردیش میں ضلع بارہ بنکی کے قصبے ردولی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ سینٹ جانس کالج آگرہ سے ایف اے اور ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ اسی زمانے میں وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے اور انھیں اپنے ساتھی شعراء میں بڑی شہرت ملی۔ حصول تعلیم کے بعد آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازمت اختیار کرلی۔ ۱۹۳۶ء میں ملازمت ترک کر کے رسالہ نیا ادب لکھنؤ سے وابستہ ہوئے۔ تین سال بعد لکھنؤ سے دہلی آ گئے اور یہاں ۱۹۴۳ء تک ہارڈنگ لائبریری (موجودہ ہردیال لائبریری) میں اسسٹنٹ لائبریرین کے فرائض انجام دیے۔ مجاز فطرتاً لاابالی تھے۔ اس لیے کسی ایک جگہ جم کر کام نہیں کر سکے۔ ۱۹۴۵ء میں یہ ملازمت چھوڑ کر محکمۂ اطلاعات حکومت ممبئی میں معاون افسر اطلاعات مقرر ہوئے۔ ممبئی میں قیام کے دوروان چند فلموں کے لیے گیت بھی لکھتے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے

(۱) مجاز کا اصل نام کیا تھا؟

(الف) نور الحق (ب) اسرار الحق

(ج) عبد الحق (د) اسرار احمد

(۲) مجاز کہاں پیدا ہوئے؟

(الف) ہردوئی (ب) رڑکی

(ج) ردولی (د) ٹونک

(۳) مجاز کس رسالے سے وابستہ رہے؟

(الف) نیا ادب (ب) نیا ورق

(ج) نئی دنیا (د) نئی صبح

(۴) مجاز درج ذیل میں سے کس ادارے سے وابستہ نہیں رہے؟

(الف) آل انڈیا ریڈیو (ب) دوردرشن

(ج) ہارڈنگ لائبریری (د) محکمہ اطلاعات ممبئی

(۵) مجاز نے کس شہر میں قیام کے دوران فلموں کے لیے گیت لکھے؟

(الف) علی گڑھ (ب) دہلی

(ج) ممبئی (د) ردولی

13.3.2 ادبی خدمات/شاعری

مجاز کی شاعری میں انقلاب، رومان اور تغزل کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ان کی شاعری اپنے عہد کے دوسرے شعراء سے جدا ہے۔اس میں انقلابی بانکپن بھی ہے اور فکر کی چاشنی بھی۔مجاز کی شاعری میں استعارات سے زیادہ تشبیہات ہیں۔ان کی شاعری میں اس دور کے معاشی اور معاشرتی حالات کے ساتھ ساتھ مجاز کی ذاتی زندگی کے المیوں کی افسردگی، جھنجھلاہٹ اور تلخی بھی ہے۔ مگر کسی قدر طرب اور شوخی بھی شامل ہے۔وہ سراپا المیہ نہیں، مجاز نے رومانی نظمیں لکھی ہیں ان میں فنی بصیرت نیز فطرت انسانی کی آ گہی کا دل کش امتزاج ہے۔

مجاز کا مجموعۂ کلام ''آہنگ'' ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔۱۹۵۲ء تک مجاز نے جو کچھ کہا وہ پھر ''آہنگ'' ہی کے نام سے شائع ہوا۔مجاز کی شاعری میں انقلابی آہنگ ملتا ہے۔خوبصورت استعارات وتشبیہات ان کی شاعری کی تاثیر میں اضافہ کرتی ہیں۔ان کی نظموں میں ایک خاص قسم کی غنائیت پائی جاتی ہے۔اندھیری رات کا مسافر اور ریل، ترانہ علی گڑھ اور آوارہ ان کی مقبول نظمیں ہیں۔

انسانی جذبات کی عکاسی میں مجاز کو مہارت حاصل ہے۔مجاز کی ایسی بہت سی نظمیں جن میں شخصیت کی تعمیر میں معاشی مسائل کا رکاوٹ بننا اور عشق میں ناکامی کی بدولت، جھنجھلاہٹ اور انقلابی کیفیت کا پیدا ہونا مترنم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔مجاز کی نظم آوارہ ایک ایسی ہی نظم ہے۔یہ مجاز کا المیہ ہی نہیں، اس دور کے ہر ایسے نوجوان کا المیہ ہے جو ان حالات سے دوچار ہوا ہے۔یہ نظم ایک ایسے بے کار نوجوان کی عکاسی کرتی ہے جو سرمایہ داروں کے شہر میں بے روزگار پھر رہا ہے اور جس کی بے روزگاری کو آوارگی کا نام دیا ہے۔اس نوجوان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے۔اس کے دل میں نہ جانے کتنی امنگیں، آرزوئیں اور حسرتیں ہیں۔بدترین حالات میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ دل میں باقی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے۔

(۶) مجاز کی شاعری میں رومان اور تغزل کے ساتھ کس طرح کا رنگ ملتا ہے؟

(الف) امن　　(ب) انقلاب

(ج) یکجہتی　　(د) تعمیری

(۷) مجاز کے یہاں درج ذیل میں سے کس کی تعداد سب سے زیادہ ہے؟

(الف) غزلیں　　(ب) رومانی نظمیں

(ج) انقلابی نظمیں　　(د) رباعیات

(۸) مجاز کی شاعری کی تاثیر میں کس چیز سے اضافہ ہوتا ہے؟

(الف) رومان وانقلاب　　(ب) موزونیت وآہنگ

(ج) ترنم ولہجہ　　(د) تشبیہات واستعارات

(۹) مجاز کا مجموعۂ کلام آہنگ سب سے پہلے کس سن میں شائع ہوا؟

(الف) ۱۹۳۸ء　　(ب) ۱۹۴۷ء

(ج) ۱۹۴۹ء　　(د) ۱۹۵۲ء

(۱۰) انسانی..................کی عکاسی میں مجاز کو بڑی مہارت حاصل ہے۔

(الف) فطرت　　(ب) عادات

(ج)جذبات　　　　　(د)اطوار

13.4 مجاز کی نظم آوارہ

13.4.1 متن

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں؟ اے وحشت دل! کیا کروں؟

جھلملاتے قہقہوں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی
اے غم دل! کیا کروں؟ اے وحشت دل! کیا کروں؟

یہ رُوپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے، کون سمجھے جی کا حال
اے غم دل کیا کروں؟ اے وہشت دل! کیا کروں؟

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ، پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی، چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل کیا کروں؟

رات ہنس ہنس کے یہ کہتی ہے کہ مے خانے میں چل
پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست! ویرانے میں چل
اے غم دل کیا کروں؟ اے وحشت دل کیا کروں؟

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں، رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غم دل کیا کروں؟ اے وحشت ول! کیا کروں؟

راستے میں رک کے دم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں، مری فطرت نہیں
اور کوئی ہم نوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لیے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لیے
پر مصیبت ہے میرا عہدِ وفا میرے لیے
اب غمِ دل کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

جی میں آتا ہے کہ اب عہدِ وفا بھی توڑ دوں
ان کو پا سکتا ہوں میں، یہ آسرا بھی چھوڑ دوں
ہاں مناسب ہے، یہ زنجیر ہوا بھی توڑ دوں
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

ایک محل کی آڑ سے نکلا اور پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا؟ سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں، اس کا شبستاں پھونک دوں

تخت سلطاں کیا؟ میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل! کیا کروں؟ اے وحشتِ دل! کیا کروں؟

13.4.2 تشریح

۱- نظم کے پہلے بند میں شاعر اس بات پر جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتا ہے کہ میں ایک ترقی یافتہ شہر میں ہوں لیکن یہاں کی پُر رونق رات بھی مجھے خوشی اور عیش و عشرت نہیں دے سکتی۔ میں ان روشن سڑکوں پر بے سبب ادھر ادھر پھر رہا ہوں۔ اجنبی لوگوں کے درمیان مارا مارا پھر رہا ہوں۔ شاعر خود سے ہی سوال کرتا ہے کہ آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ بند کے چوتھے اور آخری مصرعے میں جو کہ ٹیپ کا مصرعہ بھی ہے، شاعر کی جھنجھلاہٹ کا اظہار ہوتا ہے جب وہ اپنے دل سے ہی پوچھتا ہے کہ میں تیرے غموں کا ازالہ کیسے کروں اور تیری وحشت کو کس طرح ختم کروں؟ دراصل شاعر کی یہی جھنجھلاہٹ اس کی بے بسی اور ناکامی کی غماز بھی ہے۔ دراصل شاعر یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ وہ اپنے دل کے غم اور وحشت کو کس طرح دور کرے؟
جاگتی سڑکوں سے مراد ہے بھیڑ بھاڑ والی سڑکیں جن پر ہر جانب چہل پہل ہو۔ اجنبی لوگوں کی بھیڑ کو شاعر نے غیر کی بستی کہا ہے۔

۲- دوسرے بند میں شاعر کہتا ہے کہ سڑک کے دونوں جانب روشن قمقموں (بتیوں) کا سلسلہ رات میں بھی دن کے جیسا سماں باندھ دیتا ہے۔ رات کی روشنی اور حسن بہت دل کش ہے لیکن میں پریشان ہوں اور میرے سینہ پر تلوار سی چل رہی ہے۔ یعنی اس شہر کے سرمایہ دار لوگ اس منور رات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور میں پریشان حال پھر رہا ہوں۔ بند کے آخری مصرعے میں شاعر اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتا ہے اور اپنے دل سے پوچھتا ہے کہ میں تیرے غموں کا ازالہ کیسے کروں اور تیر ی وحشت کو کس طرح ختم کروں؟
'رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی' سے مراد ہے کہ رات میں بھی دن جیسا روشن، خوبصورت اور دل کش منظر سامنے ہے۔ شاعر نے رات کو روشنی کے سبب دن کی موہنی تصویر سے تشبیہ دی ہے۔

۳- شاعر کہتا ہے کہ چاندنی رات میں پورے آسمان پر تارے چمک رہے ہیں۔ یہ رات کسی صوفی کے تصور اور عاشق کے خیال کی طرح دلکش اور خوب صورت ہے لیکن تمام رونق کے باوجود کوئی میرے افسردہ دل کا حال جاننے اور سمجھنے والا نہیں ہے۔ بند کے آخری مصرعے میں شاعر اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتا ہے اور اپنے دل سے پوچھتا ہے کہ میں تیرے غموں کا ازالہ کیسے کروں اور تیری وحشت کو کس طرح ختم کروں؟
صوفی کے تصور اور عاشق کے خیال میں ہمیشہ ان کا محبوب رہتا ہے۔ صوفی عشق حقیقی اور شاعر اپنے محبوب کے خیال میں غرق رہتا ہے۔ ان کے لیے اس سے زیادہ خوبصورت کوئی نظارہ نہیں ہو سکتا۔ ٹھیک اسی طرح اس چاندنی رات کا منظر بھی نہایت حسین ہے۔

۴- کہیں ستارہ ٹوٹ رہا ہے اور کہیں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں۔ معلوم نہیں کہ کن لوگوں کو یہ خوشیاں میسر ہو رہی ہیں، لیکن میں اتنا افسردہ اور غم زدہ ہوں کہ دوسروں کی خوشیاں دیکھ کر میرے دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ بند کے آخری مصرعے میں شاعر اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتا ہے اور اپنے دل سے پوچھتا ہے کہ میں تیرے غموں کا ازالہ کیسے کروں اور تیری وحشت کو کس طرح ختم کروں؟
دراصل انسان کو جب کوئی خوشی اور کامیابی نہیں ملتی تو وہ دوسروں کی خوشیوں سے بھی جلنے لگتا ہے۔ شاعری اسی مرحلے میں

داخل ہو چکا ہے جب نا کامیوں اور پریشانیوں نے اس میں جلن کا مادہ پیدا کر دیا ہے۔

۵- رات کا حسین منظر شاعر کو عیش وعشرت کی دعوت دے رہا ہے۔ کبھی مے خانے چلنے کو اکستا ہے اور کبھی کسی حسین کے غریب خانے کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن اگلے ہی لمحوں شاعر کو یہ خیال آتا ہے کہ اگر ان دونوں جگہوں پر جانا ممکن نہ ہو تو وہ اس رونق سے اور کسی ویرانے میں چلا جائے تا کہ دنیا کی رنگارنگی اسے عیش وعشرت کی جانب مائل نہ کرے۔ بند کے آخری مصرعے میں شاعر اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتا ہے اور اپنے دل سے پوچھتا ہے کہ میں تیرے غموں کا ازالہ کیسے کروں اور تیری وحشت کو کس طرح ختم کروں؟

۶- ہر طرح خوبصورتی اور رونق بکھری ہوئی ہے جو شاعر کو عیش وعشرت کی دعوت دے رہی ہے لیکن اس عیش کے ساتھ ہی رسوائی اور بدنامی بھی قدم سے قدم ملا کر شاعر کی جانب بڑھ رہی ہے۔ ایسے حال میں شاعر رنجیدہ اور پریشان ہو کر اپنے بے چین دل سے ہی مخاطب ہوتا ہے اور پوچھتا ہے کہ میں تیرے غموں کا مداوا کیسے کروں اور تیری وحشت کا کیا علاج کروں؟

شاعر نے رنگینیوں کے لیے بکھرنا، عشرتوں کے لیے انگڑائیاں لینا، جبکہ رسوائیوں کے لیے گود پھیلانا استعما کیا ہے جو کہ بہت خوب ہے۔

۷- شاعر بے چینی کے عالم میں پھر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایسی بے قراری کے عالم میں کہیں ٹھہرنا اور آرام کرنا میری عادت کے خلاف ہے اور واپس لوٹ جانا بھی میری فطرت قبول نہیں کر سکتی۔ شاعر اپنی قسمت کا بھی شکوہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ کوئی ہم خیال اور ہمدرد ملنا بھی میرے مقدر میں نہیں ہے۔ ایسی صورت میں شاعر اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتا ہے اور اپنے دل سے پوچھتا ہے کہ میں تیرے غموں کا ازالہ کیسے کروں اور تیری وحشت کو کس طرح ختم کروں؟

۸- شاعر کہتا ہے کہ بہت سے حسین چہرہ محبوب میرے انتظار میں ہیں۔ میرے لیے غیروں کے بہت سے دروازے کھلے ہوئے ہیں، جو مجھے عیش ونشاط کی دعوت دے رہے ہیں، لیکن میں نے جو وفا کا عہد کیا ہوا ہے وہی میرے لیے مصیبت ہے اور میں ان حسیناؤں اور عیش وعشرت کی جانب نہیں قدم بڑھا پاتا۔ شاعر اپنے آپ پر غصہ آتا ہے اور وہ اپنے دل سے ہی اس کا حل معلوم کرتا ہے۔

اردو شاعری میں گل، شمع اور ماہ ایسے استعارات ہیں جو محبوب کے لیے رائج ہیں۔ لیکن کبھی کبھار ان کو دشمن جاں اور بلا کہہ کر بھی مخاطب کیا جاتا ہے۔ شاعر نے طوفان بلا کو حسینوں کے ہجوم کے طور پر استعمال کیا ہے۔

(۹) اپنے ماحول سے بے چین ہو کر شاعر کہتا ہے کہ اب میرا دل چاہتا ہے کہ میں وفا کرنے کا اپنا عہد توڑ دوں۔ یہ امید بھی ترک کر دوں کہ میں ایک دن اپنے محبوب کو حاصل کر لوں گا اور جب عہد وفا اور محبوب کو پانے کی امید دونوں ہی جاتی رہیں تو پھر یہ سانسوں کا سلسلہ بھی بے معنی ہے۔ گویا شاعر ناامیدی کے عالم میں یہ سب کچھ کرنے کو تیار ہے اور پھر ایسے حال میں اے غم زدہ دل کو ہی پکار اٹھتا ہے۔

(۱۰) ایک محل کے پیچھے سے پیلے رنگ کا چاند نمودار ہوا ہے۔ یہ چاند مولوی کے عمامے یا بنیے کی کتاب جیسا معلوم ہوتا ہے۔ مولوی کا عمامہ اور بنیے کی کتاب کسی دوسرے کو فیض نہیں پہنچاتے بلکہ دوسروں کو تکلیف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح غریب کی جوانی اور بیوہ کا شباب بھی خود ان کے لیے بے لطف اور بے معنی ہوتا ہے۔ لیکن ان سبھی چیزوں میں ایک بات مشترک ہوتی ہے کہ یہ دیکھنے میں بہت پھیکے، بدرنگ اور افسردہ معلوم ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح چاند کا رنگ بھی پیلا

اور بے رونق ہے۔

(۱۱) افسردگی کی حالت میں شاعر کو چانداور تارے بھی مردہ معلوم ہوتے ہیں۔ان میں شاعر کو کوئی دل کشی اور رعنائی نظر نہیں آتی بلکہ ان سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔اس کا دل چاہتا ہے کہ آسمان کے سار یتارے نوچ کر پھینک دے۔ایسی صورت میں شاعر اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتا ہے اوراپنے دل سے پوچھتا ہے کہ میں تیرے غموں کا ازالہ کیسے کروں اور تیری وحشت کوکس طرح ختم کروں؟

(۱۲) اس بند میں شاعر کی جھنجھلاہٹ کا اصل سبب سامنے آتا ہے 'مفلسی'۔وہ کہتا ہے کہ میں غریب اور بے سروسامان ہوں۔ایک جانب یہ شاندار نظارے ہیں اور دوسری جانب میری خالی جیب۔ان حالات میں عیش وعشرت کرنے والے سرمایہ دار لوگ شاعر کو ظالم بادشاہ اور بے رحم حملہ آور معلوم ہوتے ہیں۔بند کے آخری مصرعہ میں شاعر اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتا ہے اوراپنے دل سے پوچھتا ہے کہ میں تیرے غموں کا ازالہ کیسے کروں اور تیری وحشت کوکس طرح ختم کروں؟

چنگیز خان اور نادر شاہ کو تاریخ میں بے رحم حملہ آوروں کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جو قتل وغارت گری کے ساتھ ساتھ لوٹ مار کے لیے بھی مشہور تھے۔اسی لیے شاعر نے غریبوں کے مال پر عیش وعشرت کرنے والے سرمایہ داروں کو بے رحم اور لٹیرا کہنے کے لیے ان استعاروں کا استعمال کیا ہے۔

(۱۳) اب شاعر کے انقلابی تیور سامنے آتے ہیں اور وہ بغاوت کرنے اور مرنے مارنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔وہ جذباتی ہوکر سوچتا ہے کہ میں ان ظالموں کے ہتھیار چھین کر توڑ دوں۔ان کے سر پر سجے قیمتی پتھروں کو نوچ ڈالوں یعنی ان کے تخت وتاج اور حکمرانی ختم کردوں۔باغی نوجوان اس کام کے لیے کسی اور کے آگے بڑھنے کا منتظر نہیں بلکہ خود ہی پہل کرنا چاہتا ہے پھر وہ اپنے دل سے مشورہ کرتا ہے کہ میں کیا کروں؟

(۱۴) انقلابی نوجوان کے جذبات عروج پر ہیں اور وہ کہتا ہے کہ میں ان عیش وعشرت کی محفلوں کو خاک کردوں گا،مسرت ونشاط کے گلشنوں کوجلا ڈالوں گا اور آرام دہ گھروں کو پھونک ڈالوں گا۔میں صرف بادشاہ کا تخت ہی نہیں بلکہ سارا شاہی محل نیست ونابود کردوں گا تا کہ کوئی دوسرا حکمراں اس کی جگہ نہ لے اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے۔آخر میں وہ ایک مرتبہ پھر سے اپنے دل سے مخاطب ہوکر وہی سوال دہراتا ہے۔

13.4.3 خلاصہ/مرکزی خیال،محاسن

اسرارالحق مجاز کو انسانی جذبات کی عکاسی میں بڑی مہارت حاصل ہے۔انھوں نے اپنی نظموں میں رومان اور انقلاب کو مترنم انداز میں پیش کیا ہے۔مجاز کی نظم آوارہ ایک ایسی ہی نظم ہے۔یہ نظم ایک ایسے نوجوان کی عکاسی کرتی ہے جو سرمایہ داروں کے شہر میں بے روزگار پھر رہا ہے۔انھوں نے نوجوان کی بے کاری اور بے روزگاری کی آلودگی کا نام دیا ہے۔اس کے دل میں بہت سی امنگیں،آرزوئیں اور حسرتیں ہیں۔بدترین حالات میں بھی کچھ کرگزرنے کا حوصلہ اس کے دل میں باقی ہے۔اس نوجوان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے۔

نوجوان ایک ترقی یافتہ شہر میں ہے لیکن وہاں کی پُر رونق رات بھی اسے خوشی اور عیش وعشرت نہیں دے پاتی۔وہ ان روشن سڑکوں پر بے سبب ادھر سے ادھر پھر رہا ہے۔نوجوان خود سے ہی سوال کرتا ہے کہ آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔شاعر بار بار اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتا ہے اوراپنے دل سے پوچھتا ہے کہ میں تیرے غموں کا ازالہ کیسے کروں اور تیری وحشت کوکس طرح

ختم کروں؟ دراصل شاعر کی یہی جھنجھلاہٹ اس کی بے بسی اور ناکامی کی غماز بھی ہے۔

شہر میں بہت سے لوگ خوشیاں منا رہے ہیں لیکن نوجوان اتنا افسردہ اور غم زدہ ہے کہ دوسروں کی خوشیاں دیکھ کر اس کے دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ دراصل انسان کو جب کوئی خوشی اور کامیابی نہیں ملتی تو وہ دوسروں کی خوشیوں سے بھی جلنے لگتا ہے۔ نوجوان اسی مرحلے میں داخل ہو چکا ہے جب ناکامیوں اور پریشانیوں نے اس میں جلن کا مادہ پیدا کر دیا ہے۔

وہ بے چینی اور بے قراری کے عالم میں اپنی قسمت کو بھی برا بھلا کہتا ہے اور اسے اپنے محبوب سے ملنے کی امید بھی نہیں رہتی۔ وہ اتنا نا امید ہو گیا ہے کہ اسے چاند کی روشنی بھی پھیکی، بدرنگ اور افسردہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ چاند تاروں کو نوچ ڈالے۔ وہ اپنی مفلسی اور بے کاری کی وجہ سے جھنجھلایا ہوا ہے اور عیش عشرت کرنے والے سرمایہ دار لوگ اسے ظالم بادشاہ اور بے رحم حملہ آور معلوم ہوتے ہیں۔ وہ بغاوت کرنے اور مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ باغی نوجوان اس کام کے لیے کسی اور کے آگے بڑھنے کا منتظر نہیں بلکہ خود ہی پہل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس سرمایہ داری اور ظلم کی روایت کو ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے۔

نظم کی تشبیہات واستعارات نادر ہیں، جیسے رات کو روشنی کے سبب دن کی موہنی تصویر سے تشبیہ دی ہے۔ چاندنی رات کو صوفی کے تصور اور عاشق کے خیال کے مشابہ بتایا ہے۔

اردو شاعری میں گل، شمع اور ماہ ایسے استعارات ہیں جو محبوب کے لیے رائج ہیں لیکن کبھی کبھار ان کو دشمن جاں اور بلا کہہ کر بھی مخاطب کیا جاتا ہے۔ شاعر نے طوفان بلا کو حسینوں کے ہجوم کے طور پر استعمال کیا ہے۔

چنگیز خاں اور نادر شاہ کو تاریخ میں بے رحم حملہ آوروں کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جو قتل و غارت گری کے ساتھ ساتھ لوٹ مار کے لیے بھی مشہور تھے۔ اسی لیے شاعر نے غریبوں کے مال پر عیش و عشرت کرنے والے سرمایہ داروں کو بے رحم اور لٹیرا کہنے کے لیے ان استعاروں کا استعمال کیا ہے۔

13.5 سبق کی تلخیص

(۱) مجاز کا اصل نام اسرار الحق تھا۔ وہ اتر پردیش میں ضلع بارہ بنکی کے قصبہ ردولی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر پائی اور ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ اسی زمانے میں وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے اور انھیں اپنے ساتھی شعرا میں بڑی شہرت ملی۔

(۲) وہ آل انڈیا ریڈیو (دہلی)، رسالہ نیا ادب (لکھنؤ) اور دہلی کی ہارڈنگ لائبریری (موجودہ ہر دیال لائبریری) سے وابستہ رہے۔ وہ محکمۂ اطلاعات حکومت ممبئی میں معاون افسر اطلاعات بھی مقرر ہوئے۔ ممبئی میں قیام کے دوران چند فلموں کے لیے گیت بھی لکھے۔

(۳) اسرار الحق مجاز کو انسانی جذبات کی عکاسی میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں رومان اور انقلاب کو مترنم انداز میں پیش کیا ہے۔

(۴) مجاز کی نظم آوارہ ایک ایسے نوجوان کی عکاسی کرتی ہے جو سرمایہ داروں کے شہر میں بے روزگار پھر رہا ہے۔ اس کے دل میں بہت سی امنگیں، آرزوئیں اور حسرتیں ہیں۔ بدترین حالات میں بھی کچھ کر گزرنے کا حوصلہ اس کے دل میں باقی ہے۔ اس نوجوان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے۔

(۵) نوجوان ایک ترقی یافتہ شہر میں ہے لیکن وہاں کی پُر رونق رات بھی اسے خوشی اور عیش و عشرت نہیں دے پاتی۔ وہ بار بار اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتا ہے اور اپنے دل سے ہی پوچھتا ہے کہ میں تیرے غموں کا علاج کیسے کروں اور تیری وحشت کو کس طرح ختم کروں؟

(۶) نوجوان اسی مرحلے میں داخل ہو چکا ہے جب ناکامیوں اور پریشانیوں نے اس میں جلن کا مادہ پیدا کر دیا ہے اور دوسروں کی خوشیاں دیکھ کر اس کے دل پر چوٹ لگتی ہے اور وہ بے چین ہو کر اپنی قسمت کو برا بھلا کہتا ہے۔

(۷) وہ اپنی مفلسی اور بے کاری کی وجہ سے جھنجھلایا ہوا ہے اور سرمایہ دار لوگوں کی خوشیوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتا ہے۔

(۸) نظم کی تشبیہات و استعارات نادر ہیں، جیسے رات کو روشنی کے سبب دن کی موہنی تصویر سے تشبیہ دی ہے۔ چاندنی رات کو صوفی کے تصور اور عاشق کے خیال کے مشابہ بتایا ہے۔

(۹) اردو شاعری میں گل، شمع اور ماہ ایسے استعارات ہیں جو محبوب کے لیے رائج ہیں لیکن کبھی کبھار ان کو دشمن جاں اور بہا کہہ کر بھی مخاطب کیا جاتا ہے۔ شاعر نے طوفان بلا کو حسینوں کے ہجوم کے طور پر استعمال کیا ہے۔

(۱۰) چنگیز خاں اور نادر شاہ کو تاریخ میں بے رحم حملہ آوروں کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جو قتل و غارت گری کے ساتھ ساتھ لوٹ مار کے لیے بھی مشہور تھے۔ اسی لیے شاعر نے غریبوں کے مال پر عیش و عشرت کرنے والے سرمایہ داروں کو بے رحم اور لٹیرا کہنے کے لیے ان استعاروں کا استعمال کیا ہے۔

13.6 اپنے مطالعے کی جانچ / جوابات

(۱) (ب) اسرار الحق

(۲) (ج) ردولی

(۳) (الف) نیا ادب

(۴) (ب) دوردرشن

(۵) (ج) ممبئی

(۶) (ب) انقلاب

(۷) (ب) رومانی نظمیں

(۸) (د) تشبیہات و استعارات

(۹) (الف) ۱۹۳۸ء

(۱۰) (ج) جذبات

13.7 نمونہ امتحانی سوالات

ا- مندرجہ ذیل سوالات کا جواب تقریباً تیس سطروں میں لکھئے۔

(۱) مجاز کی حیات پر ایک تفصیلی نوٹ لکھئے۔

(۲) مجاز کی نظم نگاری پر ایک نوٹ قلم بند کیجیے۔

(۲) مندرجہ ذیل سوال کا جواب تقریباً پندرہ سطروں میں لکھیے۔

(۱) نظم 'آوارہ' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

(۲) نظم میں استعمال تشبیہات واستعارات پر اپنی رائے کا اظہار کیجیے۔

13.8 سفارش کردہ کتب

آہنگ، اسرارالحق مجاز، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۲ء

اردو ادب میں رومانی تحریک، محمد حسن، تنویر پریس، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء

نظم جدید کی کروٹیں، وزیر آغا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۰ء

اکائی 14 اخترالایمان-ایک لڑکا

ساخت

14.1 اغراض ومقاصد
14.2 تمہید
14.3 اخترالایمان کا تعارف
14.3.1 حالاتِ زندگی
14.3.2 ادبی خدمات
14.4 اخترالایمان کی نظم ''ایک لڑکا''
14.4.1 متن
14.4.2 تشریح
14.4.3 خلاصہ،مرکزی خیال،محاسن
14.5 سبق کی تلخیص
14.6 اپنے مطالعے کی جانچ، جوابات
14.7 نمونہ امتحانی سوالات
14.8 سفارش کردہ کتب

14.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

☆اخترالایمان کی حیات اور شاعری پر اظہار خیال کرسکیں گے۔
☆نظم کی تشریح کرسکیں گے۔
☆نظم کی تفہیم وتحسین کرسکیں گے۔
☆نظم کا خلاصہ اور مرکزی خیال بیان کرسکیں گے۔
☆اخترالایمان کی شاعری کے اسلوب سے واقف ہوں گے۔

14.2 تمہید

آپ نے اب تک اسرارالحق مجاز اور فیض احمد فیض جیسے ترقی پسند شعراء کی نظموں کا مطالعہ کیا ہے جنھوں نے غریبوں اور پسماندہ طبقات کی طرف خاص توجہ دی۔اسی دور میں اخترالایمان نے جدید نظم کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔انھوں نے

اپنی نظموں میں علامتوں اور استعاروں کے ذریعے احساسات کو پیش کیا۔ انھوں نے اپنی نظموں میں عام گفتگو کی زبان کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔

14.3 اختر الایمان کا تعارف

14.3.1 حالات زندگی

اختر الایمان نجیب آباد ضلع بجنور میں ۱۲؍نومبر ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی چلے آئے اور فتح پور مسلم ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ دہلی یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ ابتدا میں محکمہ سول سپلائی میں کام کیا پھر کچھ مدت تک آل انڈیا ریڈیو میں رہے۔ اس کے بعد بمبئی چلے گئے اور فلموں کے لیے کہانیاں لکھنے لگے۔ یہیں پر ۹؍مارچ ۱۹۹۶ء کو ان کا انتقال ہوا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے۔

(۱) اختر الایمان کہاں پیدا ہوئے؟

(الف) غازی پور　　(ب) الہ آباد

(ج) نجیب آباد　　(د) مراد آباد

(۲) اختر الایمان کا انتقال کس سن میں ہوا؟

(الف) ۱۹۹۴ء　　(ب) ۱۹۹۵ء

(ج) ۱۹۹۶ء　　(د) ۱۹۹۷ء

(۳) اختر الایمان نے کس محکمہ میں کام کیا؟

(الف) محکمۂ سول سپلائی　　(ب) محکمۂ موسمیات

(ج) محکمۂ فلاح و بہبود　　(د) محکمۂ دفاع

(۴) فلموں کی کہانیاں لکھنے سے پہلے اختر الایمان کس ادارے سے وابستہ رہے؟

(الف) دوردرشن　　(ب) قومی آواز

(ج) آل انڈیا ریڈیو　　(د) محکمۂ اطلاعات

(۵) دہلی آنے کے بعد اختر الایمان نے کس اسکول میں تعلیم حاصل کی؟

(الف) علی گڑھ مسلم اسکول　　(ب) فتح پوری مسلم اسکول

(ج) اسلامیہ اسکول　　(د) جامعہ ملیہ اسلامیہ

14.3.2 ادبی خدمات/شاعری

اختر الایمان نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی لیکن بہت جلد نظموں کی طرف مائل ہو گئے۔ وہ شاعری میں جذبات کا رنگ بھر دیتے ہیں، جس سے ان کی نظمیں لوگوں کو متاثر کرتی ہیں۔ انھوں نے جدید نظم کو استحکام بخشا۔ ان کی نظمیں اپنے انفرادی لب و لہجے اور زبان کے مخصوص آہنگ کی بنا پر الگ سے پہچانی جاتی ہیں۔ ان نظموں کا خاص وصف ڈرامائی پہلو ہے۔

اختر الایمان کی نظموں کا موضوع احساس ہے، ان کے یہاں احساس کو مربوط طریقے سے بیان کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے یہاں زندگی کا حوصلہ بھی ہے موت کو شکست دینے کی آرزو اور جرات بھی ہے اور نئی امیدوں کو پروان چڑھانے کی ہمت بھی۔

علامتی شاعری سیدھی سادی شاعری سے مختلف ہوتی ہے۔ الفاظ کے بظاہر جو معنی ہوتے ہیں وہ علامتی شاعری میں بدل جاتے ہیں لیکن اختر الایمان کی علامتیں اور استعارے پیچیدہ نہیں ہوتے۔ انھوں نے عام گفتگو کی زبان کو شعری اظہار کے لیے نہایت خوبی سے برتا ہے ان کے یہاں خود کلامی بھی ملتی ہے۔

ان کے کلام کے چھ مجموعے گرداب، تاریک سیارہ، آب جو، یادیں، بنت لمحات، اور نیا آہنگ شائع ہو چکے ہیں۔ چوتھے مجموعے یادیں پر انھیں ۱۹۶۲ء میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا گیا۔ اس کے علاوہ متعدد صوبائی اکادمیوں نے بھی انھیں انعامات واعزازات پیش کیے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے۔

(۶) اختر الایمان نے شاعری کی شروعات کس صنف سے کی؟

(الف) نظم (ب) غزل

(ج) قصیدہ (د) رباعی

(۷) اختر الایمان کی نظموں کا موضوع کیا ہے؟

(الف) رومان (ب) انقلاب

(ج) احساس (د) استعارہ

(۸) اختر الایمان کی علامتیں اور استعارے..........نہیں ہوتے۔

(الف) سنجیدہ (ب) رنجیدہ

(ج) پیچیدہ (د) افسردہ

(۹) اختر الایمان کی شاعری کے کتنے مجموعے شائع ہوئے ہیں؟

(الف) چھ (ب) سات

(ج) آٹھ (د) نو

(۱۰) اختر الایمان کو کس مجموعے پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا گیا؟

(الف) گرداب (ب) تاریک سیارہ

(ج) آب جو (د) یادیں

14.4 اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا''

14.4.1 متن

ایک لڑکا

دیارِ شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں کبھی کھیتوں کی مینڈوں پر

کبھی جھیلوں کے پانی میں کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کم سنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم جھٹپٹے کے وقت راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلوں میں ٹا نک ٹولیوں میں ان کے ڈیرے میں
تعاقب میں بھی گم تتلیوں کے سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
برہنہ پاؤں جلتی ریت یخ بستہ ہواؤں میں
گریزاں بستیوں سے، مدرسوں سے، خانقاہوں میں
کبھی کم سن حسینوں میں بہت خوش کام و دل رفتہ
کبھی پیاں بگولہ سا، کبھی جیوں چشم خون بستہ
ہوا میں تیرتا خوابوں میں بادل کی طرح اڑتا
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا، مڑتا
مجھے اک لڑکا آوارہ منش آزاد سیلانی
مجھے اک لڑکا جیسے تند چشموں کا رواں پانی
نظر آتا ہے، یوں لگتا ہے، جیسے یہ بلائے جاں
میرا ہمزاد ہے، ہر گام پر، ہر موڑ پر جولاں
اسے ہمراہ پاتا ہوں، یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کر رہا ہے، جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

....

خدائے عزوجل کی نعمتوں کا معترف ہوں میں
مجھے اقرار ہے اس نے زمیں کو ایسے پھیلایا
کہ جیسے بستر کم خواب ہو، دیبا و مخمل ہو
مجھے اقرار ہے یہ خیمۂ افلاک کا سایا
اسی کی بخششیں ہیں، اس نے سورج چاند تاروں کو
فضاؤں میں سنوارا اک حد فاصل مقرر کی
چٹانیں چیر کر دریا نکالے خاک اسفل سے
مری تخلیق کی، مجھ کو جہاں کی پاسبانی دی
سمندر موتیوں سے مونگوں سے کانیں لعل و گوہر سے
ہوائیں مست کن خوشبوؤں سے معمور کر دی ہیں

وہ حاکم قادر مطلق ہے، یکتا اور دانا ہے
اندھیرے کو اجالے سے جدا کرتا ہے، خود کو میں
اگر پہچانتا ہوں اس کی رحمت اور سخاوت ہے
اسی نے خسروی دی ہے لئیموں کو مجھے نکبت
اس نے یاوہ گویوں کو مرا خازن بنایا ہے
تو نگر ہرزہ کاروں کو مرا خازن بنایا ہے
مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

....

معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے میرے قبضہ میں
جزاک ذہن رسا کچھ بھی نہیں، پھر بھی، مگر مجھ کو
خروش عمر کے اتمام تک اک بار اٹھانا ہے
عناصر منتشر ہو جانے نبضیں ڈوب جانے تک
نوائے آج ہو یا نالۂ شب کچھ بھی گانا ہے
ظفرمندوں کے آگے رزق کی تحصیل کے خاطر
کبھی اپنا بھی نغمہ ان کا کہہ کر مسکرانا ہے
وہ خامہ سوزی شب بیداریوں کا جو نتیجہ ہو
اسے اک کھوٹے سکے کی طرح سب کو دکھانا ہے
کبھی جب سوچتا ہوں اپنے بارے میں تو کہتا ہوں
کہ تو اک آبلہ ہے جس کو آخر پھوٹ جانا ہے
غرض گرداں ہوں بادِ صبح گاہی کی طرح لیکن
سحر کی آرزو میں شب کا دامن تھامتا ہوں جب
یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

....

یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟
وہ آشفتہ مزاج، اندوہ پرور، اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے

کبھی چاہا تھا اک خاشاک عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب وافترا ہے، جھوٹ ہے، دیکھو میں زندہ ہوں

14.4.2 تشریح:

نظم کا پہلا بند اکیس مصرعوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی چودہ مصرعوں میں ایسے نامعلوم شخص کا بیان کیا گیا ہے جو آزادی کے ساتھ کھیت کھلیانوں، باغوں، جھیلوں اور بستی کی گلیوں میں گھومتا پھرتا ہے۔ کھیت کھلیانوں کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلص گاؤں کا رہنے والا ہے جو اپنے ہم عمر دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ کبھی صبح کے اجالے میں اور کبھی رات کے اندھیرے میں گاؤں کے حملے اور پرفضا ماحول میں گھومتا رہتا ہے۔ گاؤں کے پرفضا ماحول کو تتلیوں کی رنگارنگی اور پرندوں کی چہکار مزید خوشگوار بنا دیتی ہے۔ یہ شخص گرمی کی جھلستی دوپہروں اور سردی کی ٹھنڈی راتوں میں بےفکری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آزاد اور مسرور پرندوں کی طرح گاؤں کے دل فریب مناظر سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔

ان ابتدائی مصرعوں میں گاؤں کے مناظر اور اس شخص کی آوارگیوں کے بیان کے بعد یہ راز کھلتا ہے کہ شخص ایک لڑکا ہے جو نوجوانی کے عالم میں چشموں کے رواں اور بہتے ہوئے پانی کی طرح آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور شاعر کو یہ احساس دلاتا ہے جیسے وہ ان کا اسی کا گزرا ہوا کل ہے۔ یہ لڑکا ہر وقت شاعر کے ساتھ سائے کی طرح موجود رہتا ہے۔ جیسے کسی بھاگے ہوئے عزم کا پیچھا کررہا ہو۔ یہ لڑکا شاعر سے سوال کرتا ہے کہ کیا اختر الایمان تم ہی ہو؟

شاعر نے اپنے گزرے ہوئے کل اور آج کا موازنہ کر کے صرف اپنی زندگی کا بیان نہیں کیا ہے بلکہ تمام انسانوں کی زندگی، الجھنوں اور مصائب کا ذکر کیا ہے کہ بچپن اور جوانی میں اس قدر تبدیلی آجاتی ہے کہ جب انسان پیچھے مڑ کر اپنے ماضی میں جھانکتا ہے تو اسے یقین نہیں آتا کہ وہ واقعی اتنا بےفکر اور لاابالی تھا۔

دوسرا حصہ:

دوسرے بند میں شکوہ ہے۔ طنز اور پسپائی بھی ہے۔ اللہ کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس کی رحمت اور سخاوت کا بیان بھی ہے۔ اس بند میں انسانی اختیار کا ذکر، اللہ کی بے پایاں تخلیق کے مناظر اور سچے فن کار کی گفتگو کا سلیقہ بھی موجود ہے۔ خدا کی فیاضیوں کا بیان کرتے ہوئے مظاہر فطرت کا ذکر کیا ہے کہ چاند، تارے، دریا، اجالا، بادشاہی اور فقیری خدا تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتیں ہیں۔ بند کے آخر میں اس نے اپنی غربت کا بھی ذکر کیا ہے۔

یہ بند ایک نئے انداز سے شروع ہوتا ہے۔ شاعر میں اپنے اندر جھانکنے اور درون بینی کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔ اس کی آواز میں اعتماد آچکا ہے۔ وہ سنجیدگی سے سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اپنے عہد کی پوری دنیا پر اس کی نظر ہے، جہاں انقلاب کی آندھیاں پیچ وتاب کھا رہی ہیں۔ بڑی طاقتیں چھوٹی طاقتوں کے ساتھ کیا کیا سلوک کر رہی ہیں۔ یہاں شاعر کے لہجے میں شکوہ نظر آرہا ہے۔ مصیبت کی گھڑی میں انسان کے منہ سے جو الفاظ نکلتے ہیں ان میں شکوہ ہوتا ہے۔ دعاؤں کی چمک بھی ہوتی ہے۔ اختر الایمان طبقاتی تقسیم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ احتیاج کے شعلوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ مگر وہ لڑکا ایک بلائے جاں بن کر ان کے ساتھ ہے۔ وہ انھیں کسی بات پر ٹوکتا نہیں ہے۔ بس پوچھتا ہے کہ کیا اختر الایمان تم ہی ہو؟

تیسرا حصہ:

نظم کا تیسرے بند میں شاعر نے اپنی نارسائی احتیاج اور خودداری کی شکست و ریخت کا منظر بیان کیا ہے۔ شاعر کا مقدر فقیری ہے اور وہ روزگار کمانے کی خاطر اپنی ذہانت اور شاعرانہ کمال کو استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ وہ اپنی شاعری اپنا کلام بیچ کر روزگار کماتا ہے جسے وہ پسند نہیں کرتا۔ خود کو اس مجبوری اور کشمکش میں گھرا ہوا دیکھ کر شاعر کو نوجوانی کی آزادی کے دن یاد آتے ہیں۔

شاعر کو احساس ہے کہ اس کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے کیوں کہ تمام معیشت دوسروں کے قبضے میں ہے۔ اس لیے شاعر کو اپنی آخری عمر تک سرمایہ داروں اور مقتدر لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوششیں کرنی ہیں۔ شاعر اس بات سے واقف ہے کہ اسے خامہ سوزی اور شب بیچاری کا حوصلہ ملنا چاہیے، وہ اسے نہیں مل سکتا۔ شاعر جب اس حقیقت پر غور کرتا ہے تو اسے اپنا سراپا ایک آبلے کی مانند نظر آتا ہے۔ خود کو آبلہ سمجھنا انسانی زندگی کا ایک بلیغ استعارہ ہے۔ انسان خود میں ایک آبلہ ہے جو ساری زندگی بھرا رہتا ہے، پھر ایک دن پھوٹ جاتا ہے اور سب کچھ باہر نکل جاتا ہے۔ آرزوئیں ختم ہو جاتی ہیں، لیکن ایک حساس آدمی جب بھی کوئی قدم اٹھاتا ہے تو اس کے اندر موجود ایک لڑکا، جو اس کی نقل و حرکت کا نگراں ہے، بس ایک ہی سوال کرتا ہے۔ اس پر جھنجھلاہٹ تو ہوتی ہے لیکن یہی سوال اسے کسی ایسے قدم سے باز رکھتا ہے جس سے عزت نفس مجروح ہوتی ہو۔

چوتھا حصہ:

شاعر لڑکے کے بار بار سوال پوچھنے پر جھنجھلا کر کہتا ہے کہ ہاں وہ لاابالی، بےفکر اور آزاد منش لڑکا مر چکا ہے۔ اسے دنیا کی نمائش، دغا اور فریب نے اس قدر تنگ کیا کہ وہ اپنی موت آپ مر گیا۔ کچھ کر دکھانے اور کر گزرنے کی تمنا نے ہی اس سے اس کی زندگی چھین لی۔ شاعر سوال کرنے والے لڑکے کو کہتا ہے کہ وہ آگ جو اس لڑکے کے دل میں دہکتی تھی اور جس آگ سے وہ دنیا کی تمام برائیوں کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، وہ آگ بھی اب سرد پڑ گئی ہے۔

لڑکا اختر الایمان کا جواب خاموشی سے سنتا ہے اور پوری بات سننے کے بعد طنزیہ انداز میں مسکراتا ہے۔ اختر الایمان کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہتا ہے کہ ''نہیں، تم جھوٹ بول رہے ہو۔ وہ لڑکا مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔''

14.4.3 خلاصہ، مرکزی خیال، محاسن

اختر الایمان کی نظموں میں علامتی شاعری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ اس نظم میں بھی اختر الایمان نے خود کو شہر کے ان مصروف لوگوں کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے جو روزگار کمانے کی دھن میں اپنے اصولوں اور نظریات کا سودا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور ''ایک لڑکا'' گاؤں کی پُرسکون اور ایماندارانہ زندگی کی علامت ہے۔

اختر الایمان نے اس نظم میں ڈرامائی انداز اختیار کیا ہے۔ اس ڈرامے کے دو کردار ہیں ایک لڑکا اور دوسرے خود اختر الایمان۔ لڑکے کا کردار مرکزی ہے۔ وہ مکالماتی انداز میں گفتگو کرتے ہوئے اختر الایمان سے سوال کرتا ہے اور اختر الایمان اس کا جواب دیتے ہیں۔

اختر الایمان کی نظمیں قاری کو نتیجہ نہیں بتاتیں بلکہ نتیجہ تک پہنچنے میں مدد دیتی ہیں۔ اس نظم کے آخر میں لڑکا اختر الایمان کو جھوٹا قرار دے کر اور خود کو زندہ بتا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اور نظم ختم ہو جاتی ہے۔ اب قاری کو خود فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ لڑکے کے زندہ ہونے سے کیا مراد لے۔

شاعر نظم کے ذریعے یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ ایک اچھے انسان کو دنیا کی آزمائشیں دھوکے باز اور فریبی بناتی ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ اندر کا انسان مر گیا ہے لیکن حقیقتاً اچھا انسان ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

شاعر نے ہندوستان کے دیہات کی بڑی خوبصورت اور سچی تصویر پیش کی ہے۔ دیہاتیوں کی زندگی کتنی ہی پُرسکون اور آرام دہ کیوں نہ ہو لیکن دیہات کا نام آتے ہی وہاں کی غربت کا خیال آتا ہے۔ شاعر نے بھی نیم عریاں کم سن بچوں اور ننگے پاؤں کہہ کر گاؤں کی غربت کا ذکر کیا ہے۔

بگولا ایک دائرے کے شکل میں گھومتا ہے اور تیز ہوا کے باعث ہوا میں اٹھتا چلا جاتا ہے۔ لڑکے کو بگولا سا کہہ کر گرد وغبار سے تشبیہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ بظاہر وہ لڑکا بھی گرد وغبار کی طرح بے حیثیت اور بے ضرر ہے لیکن تند ہوائیں اس میں بھی جان ڈال دیتی ہیں اور کبھی رنج وغم اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور خوں بہاتی ہیں۔

فریبوں کا کفن اور آرزوؤں کی لحد یہ دونوں ترکیبیں نئی ہیں کہ انسان اچھائی سے برائی کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو اپنی اچھائیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ انہیں دغا اور فریب کے کفن میں لپیٹ کر اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی قبر میں اتار دیتا ہے۔ جس کے بل پر وہ اچھے کام کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ قبر اور کفن میں جو تعلق ہے اس کے سبب ان دونوں کی وجہ سے شعر کا حسن بڑھ گیا ہے۔

پہلے بند میں شاعر نے لڑکے کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ آزاد اور لا ابالی ہے لیکن دوسرے بند میں وہ لڑکے کی دوسری خصوصیات بتاتے ہوئے اسے آشفتہ مزاج یعنی دیوانہ کہتے ہیں۔ یہ دیوانگی دنیا کی برائیوں کا خاتمہ کرنے کے لیے ہے، چاہے راہ میں کتنی بھی دشواریاں آئیں، کتنے ہی غم آئیں، وہ لڑکا اندوہ پرور یعنی غموں کو پالنے اور اضطراب آسا یعنی رنج وغم کی امید میں بیٹھا ہونے کی وجہ سے آنے والے مصائب سے نہیں گھبراتا۔

اختر الایمان نے اس بند میں انسانی نفسیات کا یہ پہلو اجاگر کیا ہے کہ انسان بچپن میں جب کسی برائی کو دیکھتا ہے تو اس کو ختم کرنے کا پختہ ارادہ کر لیتا ہے لیکن اپنے آپ کو کمزور اور تنہا سمجھ کر وہ بھی دنیا کے دغا اور فریب میں الجھ جاتا ہے۔

یہ ایک معرا نظم ہے۔ نظم معرا کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ردیف اور قافیوں کی پابندی نہیں کی جاتی لیکن بحر اور وزن ایک ہونے کے سبب تمام مصرعے برابر ہوتے ہیں۔ لیکن اس نظم کے پہلے بند اکثر مصرعوں میں ردیف اور قافیہ کا خیال رکھا گیا ہے۔

ہمراہ، ہم زاد؟ ہم سن، کم سن اور نیم عریاں مرکب الفاظ ہیں جن میں سابقہ ہم، کم اور نیم لگانے سے نئے الفاظ بن گئے ہیں۔

آورہ منش، آزاد اور سیلانی مترادف الفاظ ہیں جو بے فکری کو ظاہر کرتے ہیں۔ نہفتہ خواب گاہ سے مراد پرندوں کے وہ گھونسلے ہیں جو درخت کی اندرونی شاخوں پر بنے ہوتے ہیں اور بظاہر نظر نہیں آتے ہیں۔

14.5 سبق کی تلخیص

☆ علامتی شاعری عام شاعری سے مختلف ہوتی ہے۔ الفاظ کے بظاہر جو معنی ہوتے ہیں وہ علامتی شاعری میں بدل جاتے ہیں۔

☆ نظم معرا کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ردیف اور قافیوں کی پابندی نہیں کی جاتی لیکن تمام مصرعے ہم وزن ہوتے ہیں۔

☆ اختر الایمان نے اس نظم میں ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے انسانی نفسیات کی مرقع کشی کی ہے۔

☆ اختر الایمان کی نظمیں اپنے انفرادی لب ولہجے اور زبان کے مخصوص آہنگ کی بنا پر الگ سے پہچانی جاتی ہیں۔

☆ اختر الایمان کی نظموں کا موضوع احساس ہے، ان کے یہاں احساس کو مربوط طریقے سے بیان کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔

☆ اس نظم میں بھی اختر الایمان نے شہر مصروف اور پُر فریب زندگی اور گاؤں کی سادہ پرسکون اور ایماندارانہ زندگی کو بھی پیش کیا ہے۔

14.6 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

(۱) (ج) نجیب آباد

(۲) (ج) ۱۹۹۶ء

(۳) (الف) محکمۂ سول سپلائی

(۴) (ج) آل انڈیا ریڈیو

(۵) (ب) فتحپوری مسلم اسکول

(۶) (ب) غزل

(۷) (ج) احساس

(۸) (ج) پیچیدہ

(۹) (الف) چھے

(۱۰) (د) یادیں

14.7 نمونۂ امتحانی سوالات

(۱) مندرجہ ذیل سوالات کا جواب تقریباً تیس سطروں میں لکھئے۔

(۱) اختر الایمان کی نظم نگاری پر ایک تفصیلی نوٹ لکھئے۔

(۲) نظم 'ایک لڑکا' کی روشنی میں شہر اور گاؤں کی زندگی کے فرق پر اپنی رائے قلم بند کیجیے۔

(۲) مندرجہ ذیل سوال کا جواب تقریباً پندرہ سطروں میں لکھئے۔

(۱) نظم 'ایک لڑکا' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

(۲) لڑکا شاعر سے یہ سوال کیوں کرتا ہے کہ ''کیا اختر الایمان تم ہی ہو؟''

(۳) نظم معرا کسے کہتے ہیں؟

14.8 سفارش کردہ کتابیں

۱۔ اختر الایمان کے شعری مجموعے گرداب، تاریک سیارہ، آب جو، یادیں، بنت لمحات اور نیا آہنگ

۲۔ اختر الایمان: عکس اور جہتیں، شاہد ماہلی، معیار پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۰۰ء

۳۔ اختر الایمان: تفہیم و تشخص، ڈاکٹر خواجہ نسیم اختر، رعنا پبلشر اینڈ ڈسٹری بیوٹرز کولکاتا، ۲۰۰۳ء

۴۔ اردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم، حنیف کیفی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء